نئی دہلی
کھلونا
سال نامہ
فروری ۱۹۷۱
2/50

اپنی باتیں

جب گھر کی فضا عجیب بھید بھری سی ہو جائے، گھر کے ایک دو، تین آدمی سازشیوں کے سے انداز میں الگ تھلگ رہنے لگیں۔ ان کے چہروں پر خوشی کی چاندنی کھلے لیکن زبان سے وجہ ظاہر نہ ہو، وہ الگ کمرے میں کئی کئی گھنٹے گزاریں، سرگوشیوں کے انداز میں ان کی 'واہ واہ' اور ہنسی اُبھرے؛ اور کسی "غیر" کے پہنچتے ہی وہ چُپ سادھ لیں ــــــ ہاں، جب گھر کا انداز کچھ ایسا ہو جائے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اُن کا دماغ چل گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ سال نامہ گھر میں آچکا ہے اور جن کے ہاتھ پہلے لگ گیا ہے وہ دوسروں کی چھین جھپٹ سے بچنے کے لئے اُسے چوری چھپے پڑھ رہے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسی حرکتیں کرنے میں بڑے بچّوں سے بھی بازی لے جاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس میں اُن کا (یا کسی کا بھی) قصور نہیں ہے۔ جب تک سب شوقین لوگ اپنا اپنا پرچہ الگ نہ خریدیں یہ تو ہونا ہی ہے۔ اُردو کے اتنے بڑے بڑے لکھنے والوں نے سال نامے کی محفل میں شرکت کی ہے۔ راگ رنگ، ہنسی مذاق، معلومات، تربیتی تفریح اور اصلاح دِل لگی کی ایسی پھلجھڑیاں اس کے ورق ورق پر چھوٹ رہی ہیں کہ ہر ایک کا دل پہلے خود لطف اٹھانے (اور کچھ سیکھنے) کو مچل اُٹھتا ہے ــــــ بعض لکھنے والوں نے ذرا دیر سے اپنے فن پارے بھیجے، پھر گنجائش کا مسئلہ بھی آڑے آتا رہا، اس لئے جی مار کر کئی اچھی اچھی چیزیں رد کرنی پڑیں۔ انہیں تم آنے والے پرچوں میں پڑھ سکو گے۔ سال نامہ پڑھنے کے بعد اپنی رائے لکھنا نہ بھولنا۔ ہم نے تو اپنی بساط بھر اچھے سے اچھا بنا کر پیش کیا ہے، لیکن اصل فیصلہ تو تمہارا ہے ــــــ سال نامہ تمہارے لئے ہی نہیں، تمہارے دوستوں کے لئے بھی بے مثال سوغات ہے۔ اپنے عزیز ترین دوست کو سال میں بارہ بار اپنی محبّت بھری یاد دِلانے کے لئے کھلونا کی سالانہ خریداری کا تحفہ دو۔ اس کے لئے تمہیں بس یہ کرنا ہے کہ آٹھ روپے ۹۵ پیسے منی آرڈر سے ہمیں بھیج دو اور تحفہ پانے والے کا نام، پتہ لکھ دو۔ سال نامہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیا جائے گا اور اس کے بعد بھی گیارہ مہینے تک کھلونا تمہارے خلوص اور پیار کی نشانی بن کر پہنچتا رہے گا۔ ●●

سال نامہ

کھلونا

نئی دہلی

فروری ۱۹۷۱

۲۷۵ واں پرچہ

تیئیسواں سال

نگراں : یوسف دہلوی
مدیر : الیاس دہلوی
مدیرانِ اعزازی : یونس دہلوی
ادریس دہلوی

ان کے علاوہ : ★ تصویری پہیلیاں ★ دلچسپ کھیل ★ انعامی تصویر ★ تصویری کارٹون ★ نیا مقابلہ ★ بے گنتی کارٹون ★ انعامی مقابلے اور بہت سی دل چسپیاں

قیمت سالنامہ :
۲ روپے ۵۰ پیسے

عام شمارے کی قیمت :
۷۵ پیسے

سال بھر کی قیمت :
۸ روپے ۹۵ پیسے
(مع رجسٹری خرچ سالنامہ)

مطبوعہ : امپیریل پریس، دہلی ٹائٹل کے صفحات : ریکن پرنٹرز، دہلی

مالکان : شمع بکڈپو
طابع و ناشر : یونس دہلوی

علامہ اقبال (مرحوم)

شہد

اس پھول پہ بیٹھی کبھی اُس پھول پہ بیٹھی
کیوں آتی ہے گلزار میں کیا کام ہے اس کا
چہکارتے پھرتے ہیں جو دُنیا میں پرندے
عاشق ہے یہ قمری کی کہ بُلبُل پہ ہے شیدا
دِل باغ کی کلیوں سے تو اٹکا نہیں اِس کا؟
سبزے سے ہے کچھ کام کہ مطلب ہے صبا سے؟
بھاتا ہے اسے پھول پہ بُلبُل کا چہکنا؟
پیغام کوئی لاتی ہے بُلبُل کی زبانی؟
کیوں باغ میں آتی ہے؟ یہ بتلاؤ تو جانیں
بے وجہ تو آخر کوئی آنا نہیں اِس کا
بے سُود نہیں باغ میں اِس شوق سے اُڑنا
کرتی نہیں کچھ کام اگر عقل تمہاری
کہتے ہیں جسے شہد وہ اِک طرح کا رس ہے

بتلاؤ تو کیا ڈھونڈتی ہے شہد کی مکھی
یہ بات جو سمجھاؤ تو سمجھیں تمہیں دانا
کیا شہد کی مکھی کی ملاقات ہے اِن سے
یا کھینچ کے لاتا ہے اسے سیر کا چسکا
بھاتا ہے اسے ان کے چٹکنے کا تماشا
یا پیار ہے گلشن کے پرندوں کی صدا سے؟
یا سرو پہ بیٹھے ہوئے قمری کا یہ گانا؟
یا کہتی ہے یہ پھول کے کانوں میں کہانی
کیا لینے کو آتی ہے؟ یہ سمجھاؤ تو جانیں
ہشیار ہے مکھی اِسے غافل نہ سمجھنا
کچھ کھیل میں یہ وقت گنواتی نہیں اپنا
ہم تم کو بتاتے ہیں سُنو بات ہماری
آوارہ اِسی چیز کی خاطر یہ مگس ہے

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مدت تک بچوں کے لئے نظمیں کہیں۔ ان میں سے بعض نظمیں ان کے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ لیکن زیرِ نظر نظم "شہد کی مکھی" اُن کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ میں نے اس نظم کا مسودہ، علامہ مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ۱۹۶۵ میں فقیر سید وحید الدین کے ہاں کراچی میں دیکھا تھا اور وہیں سے یہ نظم میں نے نقل کی تھی۔ "کھلونا" پڑھنے والے بچوں کے لئے یہاں پیش کی جا رہی ہے ——

—— جگن ناتھ آزاد

کی مکھی

رکھا ہے خدا نے اسے پھولوں میں چھپا کر
مکھی اسے لے جاتی ہے چھتے میں اڑا کر

ہر پھول سے یہ چوستی پھرتی ہے اسی کو
یہ کام بڑا ہے اسے بے سود نہ جانو!

مکھی یہ نہیں ہے کوئی نعمت ہے خدا کی
ملتا نہ ہمیں شہد، یہ مکھی جو نہ ہوتی

اس شہد کو پھولوں سے اڑاتی ہے یہ مکھی
خود کھاتی ہے اوروں کو کھلاتی ہے یہ مکھی

انسان کی، یہ چیز غذا بھی ہے، دوا بھی
قوت ہے اگر اس میں تو ہے اس میں شفا بھی

رکھتے ہو اگر ہوش تو اس بات کو سمجھو
تم شہد کی مکھی کی طرح علم کو ڈھونڈو

یہ علم بھی اک شہد ہے اور شہد بھی ایسا
دنیا میں نہیں شہد کوئی اس سے مصفّا

ہر شہد سے جو شہد ہے میٹھا وہ یہی ہے
کرتا ہے جو انسان کو دانا وہ یہی ہے

یہ عقل کے آئینے کو دیتا ہے صفائی
یہ شہد ہے انساں کی، وہ مکھی کی کمائی

سچ سمجھو تو انساں کی عظمت ہے اسی سے
اس خاک کے پتلے کو سنوارا ہے اسی نے

پھولوں کی طرح اپنی کتابوں کو سمجھنا
چسکا ہو اگر تم کو بھی کچھ علم کے رس کا

کھیلوں کے قاعدے

اسکول میں تم دوڑ میں تو حصہ لیتے ہی ہو گے اور تمہیں اس کے "قاعدے" بھی معلوم ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہم تم سے چار سوال کر رہے ہیں۔ ان کے جواب ایک پوسٹ کارڈ (سال نامہ میں شائع ہونے والے تمام مقابلوں کے جواب ایک ہی لفافے میں علیحدہ علیحدہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔) پر لکھ کر "کھیلوں کے قاعدے، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ا" کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۲ فروری تک ملنے والے صحیح جوابوں میں سے دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔
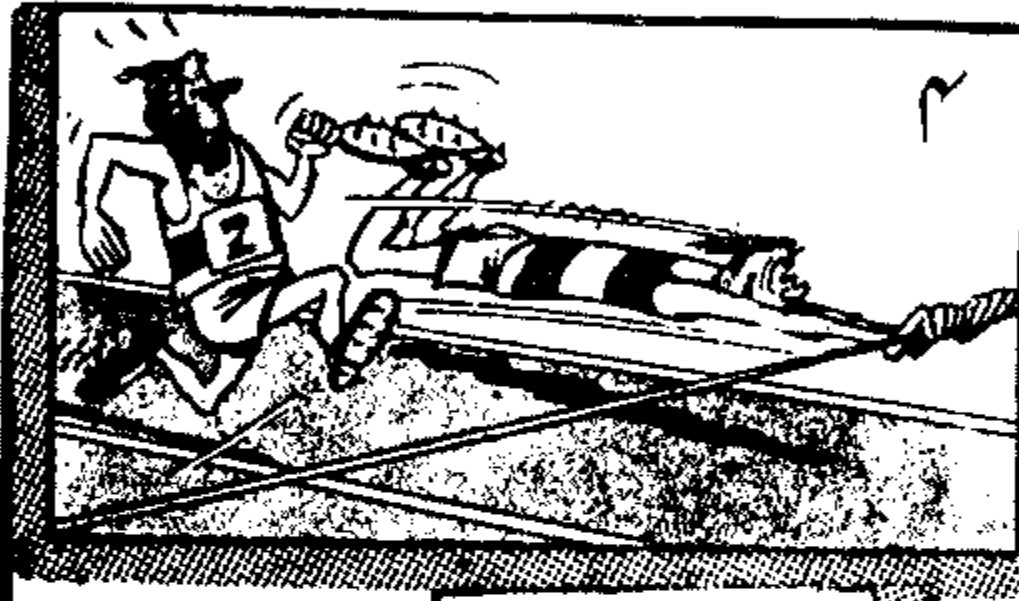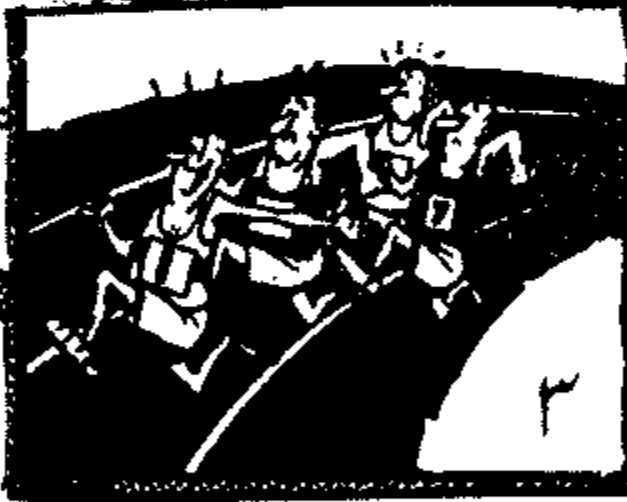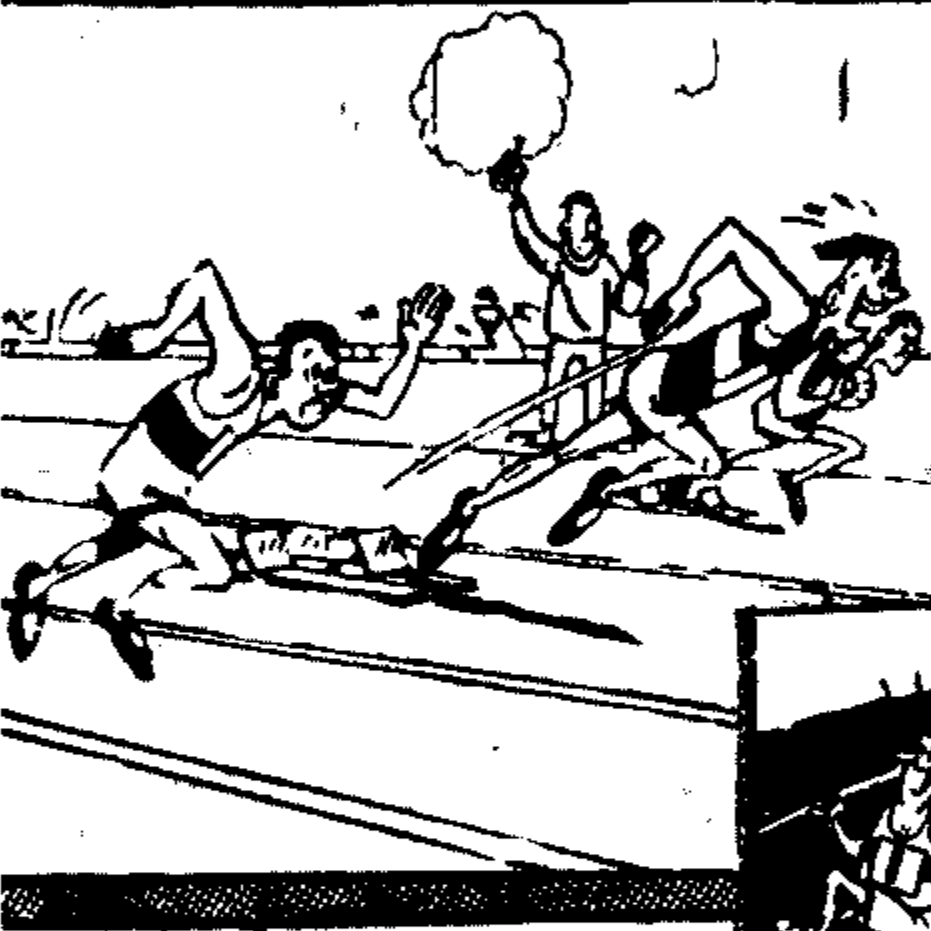
۱۔ کیا دوڑ شروع کرتے وقت کوئی کھلاڑی اپنے پیروں کے نیچے اسپرنگ لگی ہوئی گدیاں رکھ سکتا ہے، تاکہ اس کی پہلی چھلانگ اپنے آپ لمبی ہو جائے؟ ۲۔ کیا کوئی دوڑنے والا اگر چاہے تو ننگے پاؤں دوڑ سکتا ہے؟

۳۔ بہم گز کی دوڑ میں کیا کوئی کھلاڑی دوڑنے کے لئے اپنی 'سٹرک' بدل سکتا ہے؟

۴۔ جب مقابلہ تقریباً برابر کا ہو تو کیا کوئی کھلاڑی رسّی کو پہلے چھونے کے لئے اپنے ہاتھ آگے پھینک سکتا ہے؟

کھیلوں کے قاعدے، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی ا

خواجہ احمد عباس

چاچا نہرو نے کہانی سُنی

چاچا نہرو کے بچپن کا دَور بڑی ہنسی خوشی کا دَور تھا۔ ان کو شروع سے ہی کہانیاں سُننے کا بے حد شوق تھا۔ اُن کی ماتا جی جب دِن بھر کے کام کاج سے فارغ ہوتیں تو بیٹے کو گود میں بٹھا کر مہابھارت اور رامائن کی کہانیاں سُنائیں ——— کوروؤں اور پانڈوں کی لڑائی، کرشن بھگوان کا بچپن، ان کا گوپیوں کے ساتھ راس لیلا کھیلنا، رام اور سیتا اور لکشمن کا بَن باس، کیسے رام نے اپنے باپ کے وچن کا پالن کرنے کے لئے چودہ برس تک جنگلوں کی خاک چھانی، کیسے راون سیتا کو اٹھا کر لے گیا۔ کیسے رام اور لکشمن نے ہنومان کی مدد سے لنکا کو فتح کیا اور سیتا کو راون کی قید سے چھڑایا ——— اور اسی طرح کی ولولہ اور جوش پیدا کرنے والی کہانیاں وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو سُنایا کرتی تھیں۔

چاچا نہرو کی ماسی کو بھی بہت سی کہانیاں یاد تھیں دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں، راکھشسوں اور اپسراؤں کی

کہانیاں "ایک تھا راجہ، ایک تھی رانی، ان کی تھیں سات بیٹیاں . . . ." قسم کی کہانیاں ـــــ اور وہ بھی یہ سب کہانیاں ننھے جواہر لال کو سُناتی تھیں۔ اور وہ بڑے شوق سے اُن کو سُنتے تھے۔

اور پھر اُن کے پتا پنڈت موتی لال نہرو کے ایک منشی تھے ـــــ منشی مُبارک علی۔ ان کی لمبی داڑھی تھی، وہ بڑے نرم دل تھے۔ بچّوں سے بہت محبّت کرتے تھے ـــــ اور ننھے جواہر سے خاص طور پر بہت کرتے تھے۔ جب کبھی ننھے جواہر لال دُکھی یا پریشان ہوتے وہ منشی مبارک علی کے گھر چلے جاتے جو اُن کی کوٹھی ہی کے احاطے میں تھا۔ وہاں منشی جی اُن کی بڑی خاطر و مدارات کرتے۔ مٹھائی کھلاتے، شربت پلاتے، پھر گود میں بٹھا کر اُن کو الف لیلے کی کہانیاں سُناتے ـــــ اُڑنے والے گھوڑے کی کہانی، علی بابا چالیس چور کی کہانی اور جادو کی چراغ کی کہانی۔

کبھی کبھی منشی جی ۱۸۵۷ کے "غدر" کی سچّی کہانیاں بھی سناتے۔ جب ہندو مسلمان فوجی سپاہیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوت کی تھی اور آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ مبارک علی اُس وقت کم عمر تھے۔ اُن کے خاندان کے لوگوں نے بھی اس لڑائی میں حصّہ لیا تھا اور قربانیاں دی تھیں۔ کتنوں ہی کو انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا تھا اور "غدر" کی داستان کہتے کہتے منشی جی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اُن کی آواز بھرّا جاتی۔ کیوں کہ یہ کوئی فرضی کہانی نہیں تھی، دیوی دیوتاؤں کی کہانی نہیں تھی، جنوں اور پریوں کی کہانی نہیں تھی، کسی اُڑنے والے قالین اور کسی جادو کی چراغ کی کہانی نہیں تھی۔ یہ کہانی تو تھی ان لوگوں کی ـــــ اور اُن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر ملک کو آزاد کرانا چاہا تھا۔ جنھوں نے اپنی جانیں دے کر ملک میں آزادی کے جذبے کو زندہ کر دیا تھا۔

اس وقت ننھا بچہ جواہر لال "آزادی" کے معنی نہیں جانتا تھا "قربانی" کا مطلب بھی نہیں سمجھتا تھا "موت" کسے کہتے ہیں، یہ بھی اسے پتہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی یہ کہانیاں اُس کو سب سے اچھی لگتیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان واقعات کا اُس کی اپنی آنے والی زندگی سے گہرا تعلق ہے اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف جنگ کرے ـــــ وہ جو کسی دوسرے ملک سے آئے تھے اور جنھوں نے ہندوستان کو غلام بنایا تھا، اُن کو کیا حق تھا ہندوستان پر حکومت کرنے کا؟ جب وہ اس خواہش کا اظہار کرتے تو منشی جی کہتے "بیٹا، پہلے بڑے ہو جاؤ، پھر انگریزوں سے بھی لڑ لینا۔" اور جواہر لال کا جی چاہتا کہ کسی طریقے سے وہ ایک دم بڑا ہو جائے اور ظالم انگریز حکمرانوں کے خلاف فوراً لڑائی شروع کر دے۔

جواہر لال نہرو کی ماتا جی اپنے دھرم کو بہت مانتی تھیں۔ وہ پوجا پاٹھ بھی کرتی تھیں، مندر بھی جاتی تھیں، اور اس وقت اپنے بچّے کو بھی ساتھ لے جاتی تھیں، لیکن ان کے دل میں دوسرے مذہبوں اور ان کے ماننے والوں کے خلاف کوئی تعصب، کوئی بیر نہیں تھا، کوئی نفرت نہیں تھی۔ اسی لئے وہ اپنے بچّے کو منشی مبارک علی کے گھر جانے سے، اُن کے ہاں کھانے پینے سے کبھی نہ روکتیں۔ اور جواہر لال کے پتا پنڈت موتی لال نہرو تو بڑے ہی روشن خیال انسان تھے۔ جو انسانوں انسانوں میں کسی قسم کا بھید بھاؤ کرنا بہت ہی بُرا سمجھتے تھے۔

سو جواہر لال نہرو کو بچپن سے ہی ایسا ماحول ملا جہاں ہندو مسلمان کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہوں

مناتے۔ خوب رنگ کھیلتے۔ دیوالی پر سارے گھر میں ہزاروں چراغ جلتے۔ یہ دونوں تہوار ننھے جواہر کو بہت پسند تھے دسہرے کا تہوار بھی انہیں پسند تھا، کیونکہ اس میں رام لیلا کھیلی جاتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ عید بھی مناتے ریشمی شیروانی، ٹوپی اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر منشی مبارک علی کے گھر جاتے۔ تتلاتی ہوئی زبان میں کہتے "منشی چاچا۔ عید مبارک۔" وہ ایک روپیہ عیدی کا دیتے۔ جواہر لال جھک کر سلام کرتے۔ منشی جی بچے کو گلے لگاتے اور کہتے "بیٹے تمہیں بھی عید مبارک۔" وہاں کھانے کو دودھ میں پڑی سویّاں ملتیں۔ جواہر لال شوق سے کھاتے۔ پھر منشی جی ننھے بچے کی انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ عیدگاہ لے جاتے۔ وہاں جواہر لال مسلمان بچوں کو "عید مبارک" کہتے اور ان سے عید ملتے۔

اسی طرح محرّم کے زمانے میں منشی مبارک علی جواہر لال نہرو کو مجلسوں میں لے جاتے۔ وہاں وہ کربلا کے واقعہ کے بارے میں مرثیے اور نوحے سنتے، امام حسین اور ان کے بہتّر ساتھیوں کی شہادت کا ذکر سنتے، جس کا گہرا اثر ان کے دل پر ہوتا اور وہ سوچتے: آدمی ہو تو ایسا ہو جو سچائی کے لئے جان دے دے، مگر ظلم اور ناانصافی کے سامنے سر نہ جھکائے۔

منشی مبارک علی نے کافی عمر پائی۔ جواہر لال نہرو انگلستان پڑھنے گئے۔ برسوں کے بعد وہاں سے واپس آئے اس وقت منشی مبارک علی اس قابل نہیں تھے کہ وہ جواہر کو (جسے وہ بیٹے کی طرح چاہتے تھے) لینے سٹیشن پر جائیں۔ وہ بیمار تھے۔ پلنگ سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جواہر لال سے ملنے نہیں جا سکتے تھے۔ مگر جواہر لال خود ان کے پاس گئے منشی جی نے انہیں گلے لگایا اور خوب دعائیں دیں۔

پھر جواہر لال کی شادی ہو گئی۔ اور جہاں دولہا دلہن نے خاندان کے بڑے بوڑھوں کے پاؤں چھوئے اور ان کا آشیرواد لیا وہاں وہ منشی مبارک علی کے گھر بھی گئے، اور ان کے پیر بھی چھوئے۔ انہوں نے جواہر کو گلے لگا لیا اور اس کی بیوی کملا کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر دعا کی: "اللہ تعالیٰ، ایک التجا ہے، جواہر کی اولاد کو دیکھ لوں۔ پھر مجھے اپنے پاس بلانا۔"

اور جب کملا نہرو نے اندرا کو جنم دیا تو ننھی بچی کو کپڑوں میں لپیٹ کر دائی منشی مبارک علی کے گھر لے گئی۔ اور ان کی گود میں رکھ دیا۔ بوڑھے مبارک علی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے ــــ موتی لال نہرو سے بولے: "بھائی صاحب، آپ کو پوتا مبارک ہو، خدا اس بچے کی عمر دراز کرے۔ خدا کرے، جیسے جواہر آپ کا نام روشن کر رہا ہے اسی طرح یہ بچہ جواہر کا جانشین بنے اور اس کا نام روشن کرے۔"

منشی مبارک علی کا آخری دم تھا ــــ اس وقت موتی لال نہرو نے اشارے سے سب کو منع کر دیا کہ کوئی منشی جی کی غلط فہمی کو دور نہ کرے ــــ تھوڑی دیر بعد منشی جی اگلی دنیا کو سدھار گئے ــــ یہی سمجھتے ہوئے کہ جواہر لال نہرو کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ مگر ان کی پیشین گوئی صحیح نکلی۔ جواہر لال نہرو کی اولاد ــــ اندرا۔ نہ صرف ان کی جانشین بنی بلکہ اس نے ان کا اور اپنے ملک کا نام بھی روشن کیا۔

منشی مبارک علی کی یاد ہمیشہ جواہر لال نہرو کے دل میں رہی۔ انہوں نے اپنی "آپ بیتی" میں لکھا بھی ہے: "منشی جی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی محبت کرنے والی شخصیت کی یاد آج بھی میرے دل میں رہتی ہے۔" ■■

کار چلانے کا مقابلہ

(دو یا دو سے زیادہ کھلاڑی لوڈو کے "دانے" اور گوٹوں سے کھیلتے ہیں۔ جب تک ۶ نہ آئے، "کار" اسٹارٹ نہ ہوگی۔)

اسٹارٹ

1 2 3 4 5 6 7 8

کوئی رکاوٹ نہیں ۱۰ میں جایئے

موڑ

۱۲ میں جایئے

10 11 12 13 14 15 16 17 18 19 20

دو طرفہ ٹریفک

۱۲ میں واپس

ٹریفک کا دائرہ

ایک باری چھوڑیے

21 22 23 24 25 26 27 28 29 30

پل کے نیچے

۲۶ میں واپس

31 32 33 34

آہستہ

ایک باری چھوڑیے

35 36

چوراہا

آگے بڑھنے کے لئے ۶ لائیے

37 38 39 40 41

۳۸ میں واپس

42 43 44 45 46

موڑ

۴۴ میں واپس

47 48 49 50 51 52 53 54 55 56 57 58

موڑ

ایک باری چھوڑیے

59 60 61 62 63 64 65

۶ آنے تک انتظار

66 67 68 69

آپ جیت گئے!

مقابلہ ختم

شب کی سیاہی ہر سُو اُمڈی آتی تھی
اور گاڑی فراٹے بھرتی جاتی تھی
ننھے میاں اِک کھڑکی کھولے بیٹھے تھے
ابو جی سے باتیں کرتے جاتے تھے

ابو جی، یہ اَنکل کون ہیں موٹے سے؟
اتنے موٹے قد میں اتنے چھوٹے سے؟
یہ جو گدا گر پیسے مانگنے آیا تھا
صورت سے تو بالکل ابو لگتا تھا؟
آپ کا کیا رشتہ ہے اس سے ابو جی؟
کچھ بھی نہیں تو آپ کی صورت کیوں تھی؟
جی چاہے، میں اس ننھی کو تکتا رہوں
آپ کہیں تو میں اس سے شادی کرلوں؟
ابو جی، جب آپ بہت ننھے سے تھے
مجھ سے کیسی کیسی باتیں کرتے تھے؟
ابو جی، یہ دُنیا کتنی پُرانی ہے؟
اتنی پُرانی جتنی ہماری نانی ہے؟
ابو جی، جب آپ کبھی مر جائیں گے
ملکِ عدم سے میرے لئے کیا لائیں گے؟

تنگ آکر ابو نے کہا، اب سو جاؤ
اور اگر سوتے بھی نہیں، چپ ہو جاؤ
چلتی رہے شب کو بھی جس بچے کی زباں
آخر بن جاتا ہے سوال کا کُبڑا انساں!

ننھے میاں نے سہم کے ابو کو دیکھا
پلکیں جھپکیں، سر کھجلایا، اور کہا
جو بچہ یہ کُبڑا انساں بن جاتا ہے
نقطے پر وہ کیسے کھڑا رہ پاتا ہے؟

احمد ندیم قاسمی

700 = 10
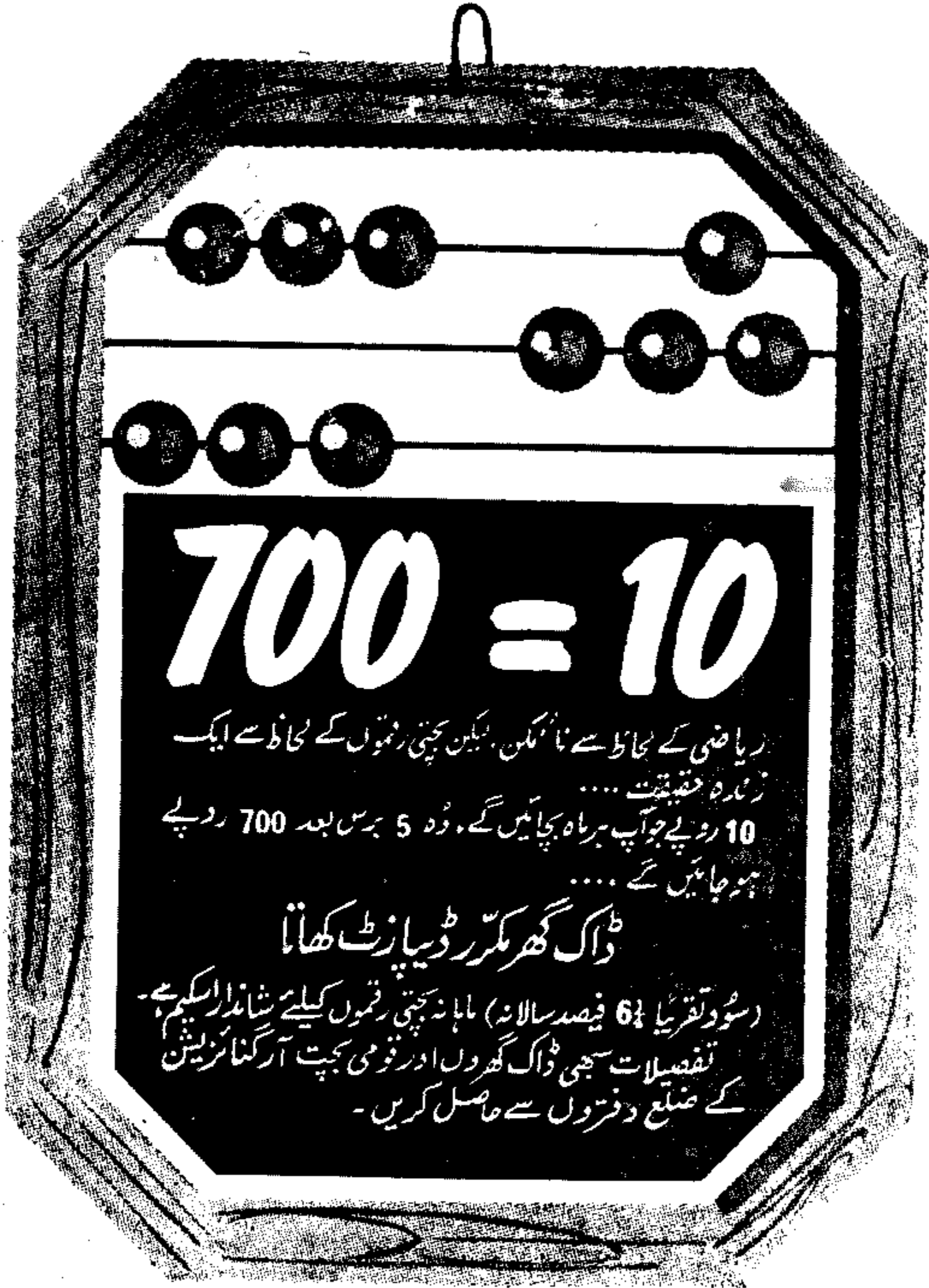
ریاضی کے لحاظ سے ناممکن، لیکن بچتی رقموں کے لحاظ سے ایک زندہ حقیقت ....

10 روپے جو آپ ہر ماہ بچائیں گے، وہ 5 برس بعد 700 روپے ہو جائیں گے ....

ڈاک گھر مکرر ڈپازٹ کھاتا

(سود تقریباً $6\frac{1}{4}$ فیصد سالانہ) ماہانہ بچتی رقموں کیلئے شاندار اسکیم ہے۔
تفصیلات سبھی ڈاک گھروں اور قومی بچت آرگنائزیشن کے ضلع دفتروں سے حاصل کریں۔
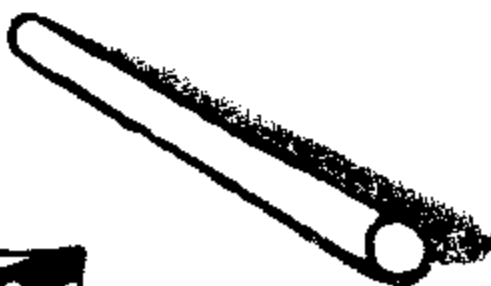
یہ بزرگ

عصمت چغتائی
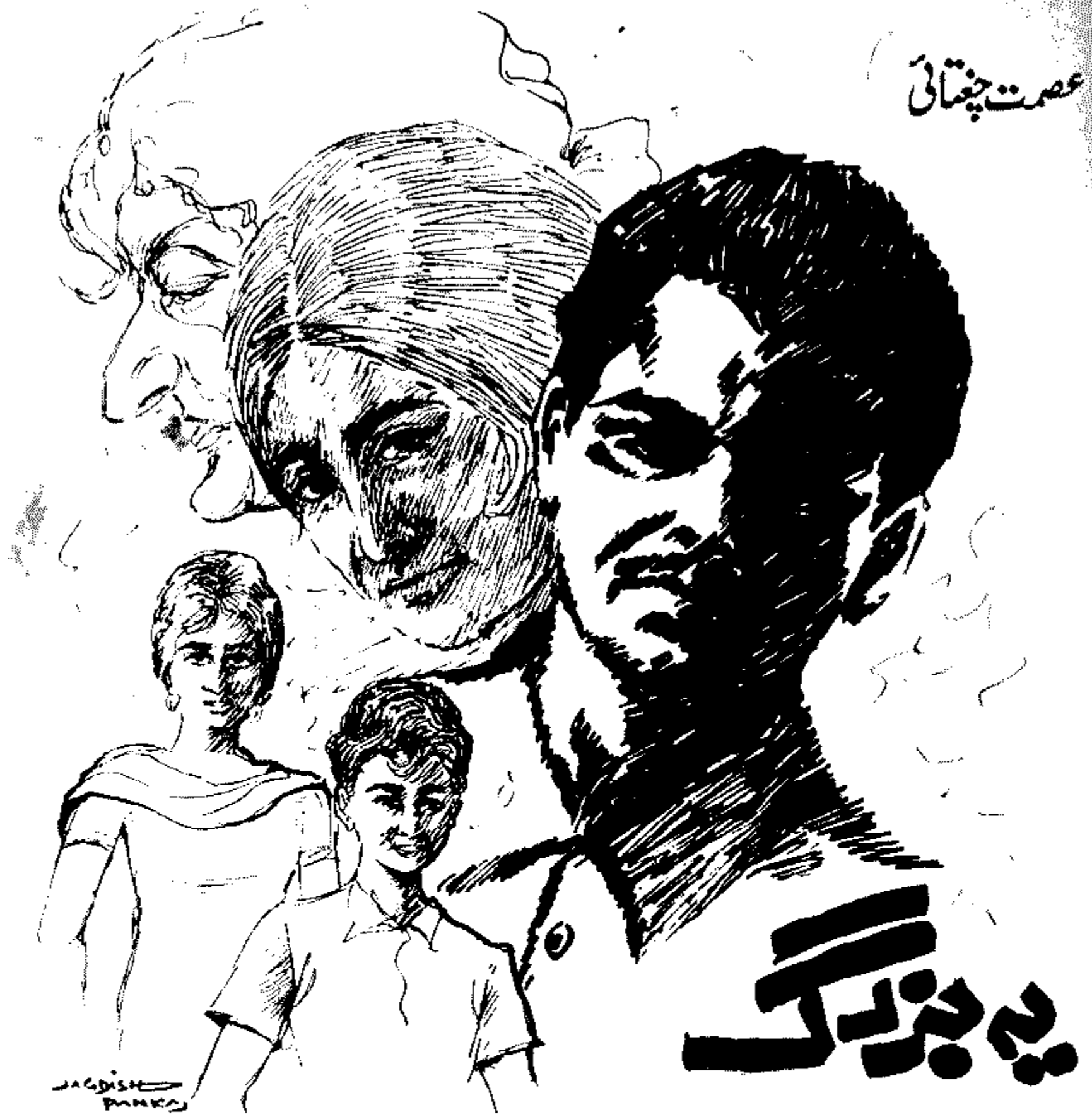
" اماں، چلو بھی "۔ سریش نے آنکھ ماری
" نہیں یار، اماں بہت ڈانٹیں گی "۔ رشید نے
موںھ بنایا۔
" کہہ دینا، ٹیوٹوریل میں دیر ہوگئی "۔
" وہ ایسے چکموں میں آنے والی نہیں ہیں۔ صدیقی صاحب
سے روزانہ ایک ایک بات پوچھتی ہیں۔ پتہ چل گیا کہ جھوٹ بولا
گیا ہے تو چمڑی اُدھیڑ دیں گی "۔
" ہت تیری کی! اتنے بڑے ہوگئے اور اب تک
اماں مارتی ہیں!" سریش نے قہقہہ لگایا۔
" مارتی تو نہیں مگر مارنے سے بدتر حالت کر دیتی ہیں۔
رونے لگتی ہیں۔ پھر ابا لیکچر جھاڑنے لگتے ہیں "۔ رشید نے ٹھنڈی
سانس بھری۔ سریش کا بھی دل بجھ گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے جان کو

میں آپ کو بچانے کے لئے نہیں آیا ہوں، صرف آپ کے لئے ایک خط لا رہا ہوں

ماں باپ کیوں لگا دئے ہیں؟ ہر وقت اِدھر سے اُدھر ہانکتے ہیں، نہائے کیوں نہیں؟ جوتے موزے سنبھال کے رکھو۔ منّی کو نہ چڑاؤ۔ وحید کے چپت نہ لگاؤ۔ اوپر سے آپا کھدیڑتی رہتی ہیں۔ اماں تو ایک دفعہ کو ٹال بھی جائیں، آپا تو جان کو آجاتی ہیں۔

زندگی کتنی بندشوں میں جکڑی ہوئی ہے! سانس لینے کی اجازت نہیں۔ پچھلے ہفتہ سرکس کے جب اُس کے ڈیڈی نے تھپڑ لگائے تھے تو اس وقت رشید کو بڑا ہی غصہ آیا تھا۔ دونوں نے پلان بنالیا تھا کہ اب یہ قید زیادہ دن نہیں جھیلی جا سکتی۔ دونوں نے بمبئی بھاگ چلنے کا پروگرام بنایا ——— وہاں جا کے مزے سے ہیرو بنیں گے اور ٹھاٹ کریں گے۔ ان منحوس کتابوں سے تو پیچھا چھوٹے گا۔ ہر سال کم بختیں پہلے سے زیادہ موٹی اور مشکل ہوتی جاتی ہیں۔ مگر پیسے کہاں سے آئیں؟ اتنے پیسے تو چُرانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ آج کل ماؤں کے بٹوے اور باپوں کی جیبیں عموماً خالی ہی ملتی ہیں۔ مہینہ پر تنخواہ آئی نہیں کہ دم بھر میں چٹ پٹ۔

آپا سے بڑھ کے دادی اماں تھیں۔ نہ ٹھیک سے دکھائی دے نہ سنائی دے، مگر ہر بات میں ٹانگ اڑائیں گی۔ وہ تو اماں اور ابا کی بھی ریڑھ مارتی رہتی ہیں۔ کھیلو تو کہیں گی،

"ہر وقت دھما چوکڑی! کیا مجال جو ایک لفظ بھی پڑھ جائے"

اور اگر پڑھ رہے ہو تو ٹوکیں گی، "اے بس کر نگوڑے اب تک پڑھے گا؟ آنکھیں چٹم ہو جائیں گی"

کبھی کہیں گی، "بس ہر وقت غائب، یہ نہیں کبھی پاس آکے بیٹھے"

اور جو پاس بیٹھو تو: "اے لڑکے کیوں میری جان پر سوار ہے۔ چل غارت ہو"

یا خدا اگر ان بزرگوں کو تو جڑنے سے پیدا ہی نہ کرتا تو کون سی تیری خدائی میں کمی آجاتی!

مگر جب اس دن رشید نے گھر میں قدم رکھا تو کچھ عجیب سا لگا۔ ہر طرف سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ سب چپ چپ سے، کچھ سہمے سے بیٹھے تھے۔ صرف دادی اماں بڑبڑا رہی تھیں، "لو بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔۔۔۔۔"

رشید نے منّی کا ربن کھینچا۔ وہ مرغی کی طرح چلائی:

"قیس!" جان بوجھ کر حمید کے کنکوے پر پیر رکھتا ہوا وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ حمید منمنانے لگا۔ مگر نہ اماں نے ڈانٹا، نہ آپا غرائیں۔ رشید انہیں کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے گزر گیا۔ جوتے اتار کر اُس نے چپل میں پیر ڈالے، پھر چونک کر آپا کی طرف دیکھا جو دروازے پر سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

"کیا ہے؟"

"ابا بلا رہے ہیں"

"کیوں؟" رشید چڑ گیا۔ اس کی رپورٹ تو کافی اچھی آئی تھی، پھر۔۔۔

"پتہ نہیں، بکواس نہ کرو۔ چلو"

"چلتے ہیں،" رشید نے بھونک کر کہا

"زبان سنبھال کے بات کرنا، ورنہ لگاؤں گی ایک تھپڑ۔"

"اجی مر گئے تھپڑ لگانے والے۔ خدا قسم ۔ ۔ ۔ ۔"

"مریم ۔ ۔ ۔ رشیدا" نیچے سے اماں نے پکارا۔

"مرد ـــ نہ چلو ۔ ۔ ۔" تن تن کرتی مریم آپا چل دیں۔

"کیا مصیبت ہے رشید نے تنگ آکر کہا۔

ابا آرام کرسی پر نیم دراز زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رشید اور مریم کو دیکھ کر تیوریاں چڑھا کر کوئی تلخ بات کہنے کی جگہ بڑی نرمی سے بولے، "آؤ آؤ آؤ" جیسے وہ دونوں کوئی معزز مہمان ہوں۔ تھوڑی دیر بے تکی خاموشی چھائی رہی۔ پھر ابا کھانسے، معنی خیز نظروں سے اماں کی طرف دیکھا، پھر مسکرائے، پھر کھانسے۔

"بیگم، تم ہی بتاؤ"

"نہیں آپ ۔ ۔ ۔ ۔"

تھوڑی دیر دونوں تکلف کرتے رہے۔ پھر ابا کھنکارے۔ اماں نے مونہہ پھیر لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جنہیں وہ چھپا رہی تھیں۔

"تمہاری سال گرہ سات فروری کو ہے نا مریم"

"جی" مریم اچھل پڑی۔

"تم پندرہ برس پورے کر کے سولھویں سال میں قدم رکھو گی؟"

"جی؟" مریم کا مونہہ فق ہو گیا۔ کیا ابا اس کی شادی طے کر رہے ہیں۔ رشید کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔

"اور تم رشید میاں، تم اکتوبر میں تیرہ سال کے ہو کر اب ـــ ارے نہیں بارہ کے ہو کر اب تیرھویں میں چل

میں نے تمہیں پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ افریقہ نہ چلو ـــ

رہے ہو" ابا ہنسے۔

"جی!" رشید کی ہتھیلیاں پسیج گئیں۔ تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔

"تمہاری اماں کا اور خود ہمارا بھی خیال ہے کہ ابھی تم دونوں بچے ہو۔ مگر ہمارا یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ تمہاری رائے لینے میں کوئی حرج نہیں"

پھر بھیانک خاموشی منڈلانے لگی۔ ابا نے اماں کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

"ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔" اماں کی آواز بھرا گئی۔

"تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے ہم مرنے جا رہے ہیں" ابا ہنسے۔

"خدا نہ کرے" اماں پھوٹ پڑیں۔

"بیٹے، ہمیں پہاڑ پر جانا پڑے گا"

"پہاڑ پر؟ مریم نے لرز کر کہا"

"ہاں کوئی ایسی خطرے کی بات نہیں۔ دائیں

"میں جب بھی خریداری کو نکلتی ہوں، حفاظت کے لئے مرچوں بھری لکڑی ضرور ساتھ رکھتی ہوں"

پھیپھڑے پر چھوٹا سا پیچ ہے —— سمجھیں ؟"

مریم نے منڈی ہلادی

"ہمارے ساتھ تمہاری اماں کو بھی جانا ہوگا۔ ویسے ہم نے تو ان سے کہا بھی کہ ان کے جانے کی ضرورت نہیں، مگر۔ ۔ ۔ ۔"

"میں ضرور جاؤں گی۔"

"یہاں بچوں کی دیکھ بھال —— کیوں بھئی تم لوگوں کی کیا رائے ہے ؟ بے کار ہے نا ان کا جانا ؟"

مریم نے رشید کی طرف دیکھا رشید کو غصہ آنے لگا۔ آج تک اس کے اپنے معاملے میں بھی کبھی کسی نے ایک رائے نہیں لی۔ ہمیشہ حکم ہی دیے گئے۔ اور آج اس سے ایسے رائے طلب کی جارہی تھی جیسے خدانخواستہ وہ بھی کوئی بزرگ ہے۔

"تمہاری پھوپی جان کو لکھا مگر وہ —— نفیسہ کے بال بچہ ہونے والا ہے، اس لئے۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ کیوں جارہے ہیں ؟" رشید نے بچوں کی طرح مچل کر کہا۔ پھر ایک دم شرم سے پانی ہوگیا۔ "میرا مطلب ہے کہ۔ ۔ ۔ آپ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہم سمجھتے ہیں، تمہارا کیا مطلب ہے۔ کاش ہمیں نہ جانا پڑتا۔" ابا نے نرمی سے کہا۔

"جی۔" رشید کے گلے میں آنسو چبھنے لگے۔

"سوال منّی اور حمید کا ہے۔ وہ بہت چھوٹے ہیں۔ کچھ نہیں سمجھتے۔ اب تمہارے سوا اور کون دیکھ بھال کرسکتا ہے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کیجئے ابا جان۔" مریم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"رشید ——"

"جی ؟"

"تم اور مریم بات بات پر لڑتے ہو۔"

"یہ آپا۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں، آپا بہت شریر ہے۔ سب آپائیں بری ہوتی ہیں۔" ہم بھی اپنی آپا سے بہت لڑا کرتے تھے مگر ہمیں تم پر بھروسہ ہے —— "اوہو، یہ مریم تو بڑی جذباتی لڑکی ہے۔" مریم کو روتا دیکھ کر ابا مسکرائے، "بیٹے تم کافی مضبوط دل والے ہو۔ روپیہ پیسہ تم چاہو اپنے ہاتھ میں رکھو چاہے۔ ۔ ۔ ۔"

"روپیہ آپا ہی رکھیں گی۔" رشید کو بڑی گھبراہٹ ہونے لگی۔

"ایک بات اور ہے۔ دولت خاں تو رہیں گے۔ باقی باورچی اور بیرا اور آیا —— ان میں سے اماں کے لئے آیا کا ہونا ضروری ہے۔ باورچی کے بغیر تمہارا کام نہیں چلے گا۔ تمہاری اماں ہوتیں تو اور بات تھی۔ مگر بیرا —— اگر۔ ۔ ۔"

"ہاں بیرے کی ضرورت نہیں۔" مریم نے رائے دی۔ کھانا بھی میں پکالوں گی۔ باورچی بھی بے کار ہے۔"

"تم کالج جاؤ گی یا کھانا پکاؤ گی ؟"

"رحمت بوا کھانا پکالیں گی۔ میرے خیال میں باورچی کو بھی الگ کر دیجئے۔ میں بھی مدد کروں گی۔" مریم نے کہا۔

"یہی ہم نے بھی سوچا تھا۔ ہمارے پاس بینک میں بہت کم روپے ہیں۔ تین مہینے پوری تنخواہ، پھر آدھی تنخواہ ملے گی۔ اس میں کیسے گزارہ ہوگا ـــــ یہ فکر ہمیں کھائے جارہی ہے۔ سوچتے ہیں، نہ جائیں۔"

"نہیں آپ کا جانا بہت ضروری ہے۔ پلیز آپ ہماری بالکل فکر نہ کیجئے گا۔"

"منّی اور حمید . . . . اماں بھی ہوئی بولیں۔"

"انہیں بھی سمجھانا ہوگا۔"

"بہت اچھے! آپ اسے دیکھ کر بے ہوش ہو کر گرے، اور وہ آپ سے ٹھوکر کھاکر گرا۔"

اماں چلنے سے پہلے کیسی بوکھلائی ہوئی تھیں۔ منّی اور حمید پہلے تو خوب مچلنے لگے، مگر جب ابّا نے سمجھایا تو انہوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ ابّا نے کہا، "بچو، تمہیں یہ بچپن بھولنا پڑے گا۔ تم لوگ وہاں نہیں جا سکتے، کیوں کہ وہاں بچوں کو رکھنے کی اجازت نہیں۔ دوسرے یہ چھوت کی بیماری ہے۔ تم لوگوں کے پھیپھڑے بہت نازک ہیں ـــــ اور اگر ہم نہ گئے تو مر جائیں گے۔"

"خدا نہ کرے۔" مریم کا جی چاہا مارے دونوں کو۔

"نہیں ابّا، آپ نہ مریے پلیز۔" منّی رو پڑی۔

ابّا کے جانے سے پہلے مریم اور رشید نے دونوں بچوں کو بلاکر کمرہ بند کرکے ایک میٹنگ کی۔

"دیکھو جی، اگر ابّا کے چلتے وقت تم لوگ رونے بیٹھے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ کھال ادھیڑ دوں گا۔" رشید غرّانے والا بسورنے لگے۔

"ہائے رشّو، اماں کے الفاظ بھول گئے۔" ان کے جانے کے بعد ہم اور تم ہی ان کے ماں باپ ہیں۔ مریم نے دونوں کو اپنے پاس کھینچ لیا۔" منّی ـــــ حمید ـــــ ابّا اور اماں جا رہے ہیں۔ ہم سب دعا کریں گے کہ وہ جلدی سے اچھے ہوکر آجائیں۔ تم روئے تو انہیں دکھ ہوگا۔ پھر ان کی بیماری اور بڑھے گی۔"

"ہم بالکل نہیں روئیں گے۔" حمید نے رو کر کہا

"میں بھی نہیں۔" منّی پھوٹ پڑی

"اسٹیشن پر چاروں بچوں نے ابّا اماں کو ہنس کر رخصت کیا۔ مگر جب گاڑی دور چلی گئی تو چاروں سسکیاں بھرتے گھر واپس آئے۔

گھر پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ منّی اور حمید تو ایسے سہم گئے جیسے یتیم ہو گئے ہوں۔ رشید ابّا کی کرسی پہ بیٹھ کر ایک دم ابّا کی طرح سنجیدہ اور بردبار ہو گیا۔ جانوروں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑنے کی بجائے وہ اس طرح حمید اور منّی کی خاطر کرنے لگا جیسے وہ مہمان ہوں۔

چھوٹے بہن بھائی کو سلاکر رشید اور مریم بڑے بوڑھوں کی طرح حساب کتاب کرنے لگے۔

صبح ہی صبح جب مریم دونوں بچوں کو تیار کرنے گئی تو ائی

آپ کے حصے کی آئس کریم میں نے نہیں کھائی ہے

نے دیکھا کہ رشید منّی کے بالوں میں بڑی محنت سے ربن باندھ رہا ہے، اور حمید خود اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے۔ ناشتے پر دونوں نے کہے بغیر نیپکن لگانے اور سلیقے سے کھانے لگے۔

باورچی اور بیرے کے جانے سے پہلے تو تکلیف ہوئی، پھر مریم اور رشید نے سر جوڑ کر حساب لگایا ـــــ کام کی تقسیم ہوگی منّی اور حمید کپڑے اور کتابیں نہیں پھیلائیں گے۔ اپنے کپڑے سلیقے سے رکھیں گے۔ پڑھائی میں ذرا کمی نہ آئے رپورٹ خراب ہوئی تو ابا کو تکلیف ہوگی اور وہ جلد اچھے نہ ہو پائیں گے۔ دادی اماں سب سے چھوٹا بچہ تھیں۔ انہیں بیماری کا نہیں بتایا تھا، ورنہ رو رو کر مر جاتیں۔ اُن سے کہہ دیا تھا کہ امتحانوں کے سلسلے میں ناگپور گئے ہیں۔

"ہے ہے! بچّوں کو چھوڑ کے میاں بیوی کیا مزے سے چل دیے! اور آنے کا نام نہیں لیتے" وہ ہر وقت بڑبڑاتیں۔

آخر کے دو مہینے بڑے کٹھن گزرے۔ ایک ایک پیسہ سنبھال کر خرچ کرنا پڑا۔ دولت خاں ٹہلیے ہوئے تھے۔ مریم اور رشید سائیکلوں پر سامان لاد کر لاتے اور صفائی سے ڈبوں میں بھرتے۔ مریم نے ابا کو دو سویٹر بُن کر بھیجے۔ ہفتے کی شام کو سب بیٹھ کر خط لکھتے۔ کھانے کی میز رشید لگاتا۔ مریم پکانے میں آیا کا ہاتھ بٹاتی۔ حمید اور منّی ڈرائنگ روم صاف کرتے۔ دادی کو پھسلانے کے لیے اُن سے پُرانی سڑی کہانیاں بیٹھ کر سنتے۔ وہی، ایک بادشاہ تھا . . . .
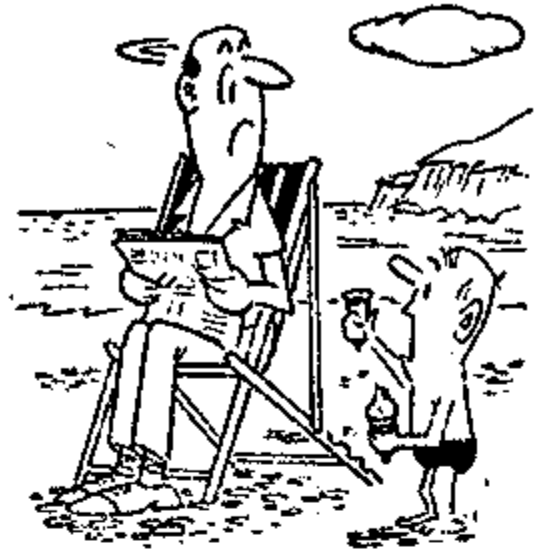
"دنیا کے بادشاہ ختم ہو رہے ہیں۔ دادی اماں کا بادشاہ نہیں مرتا" رشید چڑ کر کہتا۔ مگر دادی اماں کا دل نہ چھوٹا ہو اس لئے جو وہ سناتیں صبر سے سُنتا۔

اماں ابا واپس آرہے تھے۔ مارے خوشی کے چاروں کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ بار بار گھڑی دیکھتے رہے۔ صبح ہی صبح ڈھیر سے ہار اور پھول لے کر اسٹیشن پہنچے۔ ابا کو دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ـــــ لال چہرہ چمکتی ہوئی آنکھیں کیا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دوڑے اور چاروں کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

ابا اماں کو دیکھ کر جیسے منوں کا بوجھ رشید کے سر سے اتر گیا۔ اس نے وہیں منّی کی چوٹیاں کھینچیں اور حمید کی ناک مروڑی۔

مریم اس کا کھویا ہوا بچپن واپس آتا دیکھ کر مسکرا اٹھی۔ کبھی کبھی تو وہ رشید کو اتنا سنجیدہ دیکھ کر ڈر جاتی تھی۔

اماں کی بھی صحت بن گئی تھی۔ دونوں کے آتے ہی اُدھم شروع ہو گئی۔ بچّے ضد کرنے لگے۔ بہن بھائی لڑنے جھگڑنے لگے۔ اماں انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے لگیں۔

اُسی دن شام کو سریش نے کہا، "چلو یار بڑی زوردار پکچر لگی ہے"

"نہیں بھئی، کل ٹیسٹ ہے، اماں ڈانٹیں گی" رشید نے بسور کر کہا، اور سوچا، یا خدا تو نے یہ بزرگ پیدا ہی کیوں کیے۔

■■

گیت

ساحر لدھیانوی

ماں تُو آنسو پونچھ لے اپنے ، رونے کی کوئی بات نہیں
جب تک تیرے ساتھ ہوں میں مت سوچ کہ کوئی ساتھ نہیں

اور ذرا سا پال دے مجھ کو، پھر میں تجھ کو پالوں گا
جو مانگے گی سو لاؤں گا ، کوئی بات نہ ٹالوں گا

جو تیری جھولی میں نہ ڈالوں ، ایسی کوئی سوغات نہیں
ماں ! تو آنسو پونچھ لے اپنے ، رونے کی کوئی بات نہیں

دن بھر محنت کر کے جب میں شام کو واپس آؤں گا
اپنے پاس بٹھا کر تجکو پیار کے ساتھ کھلاؤں گا

تُو ایسا مت سوچ کہ تیرے سر پر کوئی ہاتھ نہیں
ماں ! تُو آنسو پونچھ لے اپنے رونے کی کوئی بات نہیں

کچھ دن کی تو بات ہے ماں ! یہ کچھ دن بھی کٹ جائیں گے
آج جو بادل چھائے ہیں وہ بادل کل چھٹ جائیں گے

جس کی اُجلی صبح نہ ہو ، ایسی کوئی کالی رات نہیں
ماں ! تُو آنسو پونچھ لے اپنے رونے کی کوئی بات نہیں

کامیاب
درزی خانہ
درزی خانے سے متعلق مکمل اور جامع کتاب۔ ہر قسم کے کپڑوں کی تراش سمجھائی گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے بہترین ڈیزائن کے کپڑے گھر بیٹھے تیار کئے جا سکتے ہیں
قیمت : ۲ روپے
دُلہن
کشیدہ کاری
دُلہن کی طرح سجی ہوئی اور دیدہ زیب کشیدہ کاری۔ جس کے بہترین نمونے آپ کا دل لُبھائیں گے
قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے
حسین
کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کی ایک ایسی لاجواب کتاب جس میں جدید و قدیم ہر قسم کے ڈیزائن موجود ہیں
قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے
شبنم
کشیدہ کاری
کشیدہ کاری سے متعلق ایسی کتاب جس میں ہر طرز کے ڈیزائن موجود ہیں۔
قیمت : ایک روپیہ
قدسیہ
کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کے عمدہ اور نئے نئے ڈیزائن حاصل کرنے کے لئے ہر کشیدہ کار ضرور طلب کریں۔
قیمت : ایک روپیہ
شمع بک ڈپو
آصف علی روڈ، نئی دہلی

وہ کون تھا؟

واجدہ تبسم

جب ابّو کا جنازہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اچانک کسی کمی کا احساس کیا —— کیوں کہ قسمت سے امّی بھی دو سال پہلے ہی خدا کو پیاری ہو چکی تھیں۔ میں نے بڑے سوچ بھرے انداز میں بابا سے سوال کیا "بابا اب میرے لئے گڑیا کون لایا کرے گا؟"

بابا جو ہتھیلی پر تمباکو مَل رہے تھے۔ میرے اس سوال پر دہل سے گئے۔ بہت دیر کے سوچ بچار کے بعد انہوں نے جواب دیا تھا:

"اوپر والا بھیجے گا"

یہ کئی برس پہلے کی بات ہے ـــــ اُن دِنوں
میں بالکل ننھی سی بچی تھی اور دو سال کی مختصر سی
مدت میں امی اور ابو دونوں اللہ میاں کے پاس جا چکے
تھے۔ گھر میں ہم چھوٹے چھوٹے بہنوں بھائیوں کا واحد
آسرا بوڑھی، بےکس، بیوہ نانی اماں تھیں ـــــ اور
گھر سے باہر بابا۔ (خدا تو بہرحال تھا ہی)

بابا ہمارے بڑے سے ڈھنڈار گھر کی رکھوالی
اور دربانی کرتے تھے۔ دِن بھر تمباکو کھاتے یا پیتے۔
ہتھیلی پر مل کر کھاتے، حقے میں بھر کر پیتے ـــــ
نانی اماں پردے کی آڑ سے جب بھی کھانے کا تھال
ڈیوڑھی (مردانے) میں سرکاتیں، تمباکو کا بھبارہ ان
کا استقبال کرتا۔ وہ خفت، ڈانٹ اور غصے بھرے
لہجے میں کہتیں "دیکھو بیٹا۔ تمباکو پی پی کر یہ شخص ایک
دن اپنی جان دے دے گا۔"

بابا کی تنخواہ دو روپے ماہانہ تھی ـــــ اور
اس زمانے کے دو روپے کا اندازہ اس سے لگائیے
کہ آٹا دس پیسے کا ایک من تھا۔ بکرے کا گوشت
آٹھ آنے سیر تھا، ایک پیسے میں چار سو دیے مزے سے
آ جاتے تھے۔ ایک پیسے کی شکر، چائے کی پتی، دودھ
سب ایک ساتھ آ جاتا تھا۔ ایک روپیہ پانے والا مالامال
سمجھا جاتا تھا ـــــ اور بابا کو تو دو روپے ملتے تھے۔ اور
وہ دو روپے پورے کے پورے تمباکو کی بھینٹ چڑھتے
تھے۔ جب کہ تمباکو آج مہنگائی کے اس دور میں بھی
اتنا سستا ہے!

لیکن بابا کسی کی نہ سنتے۔ دن رات کا ایک
ہی شغل تھا ـــــ تمباکو ـــــ تمباکو ـــــ تمباکو۔ وہ تمباکو
کے ایسے دھنی تھے کہ خوشی میں، غم میں، دُکھ میں
بیماری میں بھی تمباکو کھانا نہ بھولتے ـــــ ابو کا جنازہ
جا رہا تھا۔ نانی اماں پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھیں
پاس پڑوس والے، شہر والے سسک رہے تھے ـــــ
اور بابا، اگرچہ آنکھوں میں ان کی بھی آنسو تھے،
لیکن تمباکو کا شغل بہرحال جاری تھا۔

بابا ہم بچوں سے بڑی عجیب طرح کی محبت
کرتے تھے ـــــ عجیب طرح کی ان معنوں میں کہ بظاہر
بہت ڈانٹتے ڈپٹتے، لیکن صاف لگتا کہ اس ڈانٹ
ڈپٹ کی تہہ میں محبت ہی محبت ہے۔ (یہ سب کچھ تو
میں اب سوچتی ہوں!) ایک گہرے اور وسیع سمندر
کی طرح ان کا وجود سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے
لگتا۔ بابا مجھ سے خاص طور پر بڑی شفقت سے پیش
آتے۔ دوسری بہنوں بھائیوں کی طرح میں اُن سے ڈرتی
بھی نہیں تھی ـــــ نہ ان کی سفید داڑھی سے، نہ بڑی
بڑی مونچھوں سے۔ بس تکلیف صرف ایک ہی تھی اور
میں بارہا اُن سے اس تکلیف کا اظہار کر چکی تھی۔

"بابا تمہارے پاس بیٹھو تو تمباکو کی بہت بدبو
آتی ہے۔ تم تمباکو کھانا پینا چھوڑ دو نا بابا!"

وہ مسکرا کر کہتے: "نانی بی ـــــ ہم چاہیں تو
اس زندگی کو ہی چھوڑ دیں، مگر تمباکو ہم سے نہیں چھوٹ
سکتا ـــــ ہاں!"

ابو کے انتقال کے بعد ایک عید ایسی آئی کہ
ہمارے لئے نئے کپڑے بھی نہیں بنے، کھلونے بھی ہمیں
نہیں ملے، اچھے اچھے پکوان بھی نہیں پکے۔ میری

دیش بھر کے بزرگ آدمیوں کے جلسے کا صدر بنا کر آپ نے میرا
ٹھیک رتبہ پہچانا ہے

اسکول کی ایک سہیلی نے بڑے فخر سے لال لال گوٹا ٹکے
کپڑے پہنے تھے اور ساری سہیلیوں کو سنایا تھا کہ ویسے
تو وہ خود بھی بہت پیسے والے لوگ ہیں، لیکن وطن
سے ہر سال ان کے ہاں عید کے عید پوسٹ مین منی آرڈر
لے کر آتا ہے۔ کبھی چچا کا، کبھی دادا کا۔

"بابا یہ منی آرڈر کیا ہوتا ہے؟" میں نے
بابا سے بڑے تعجب سے پوچھا تھا۔ اور جب بابا نے
مجھے منی آرڈر کے معنی سمجھائے تو میں نے ٹوٹے دل
سے، بھری آنکھوں سے بابا سے پوچھا "بابا میرے نام
منی آرڈر کیوں نہیں آتا؟"

بابا نے تمباکو کی ڈبیا کو (جسے وہ اپنی زندگی کہتے
تھے) سامنے سے ہٹا کر کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔
"آئے گا بیٹی ــــ ضرور آئے گا۔ بھیجنے والے کے ہزار
ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور عید ہی کی کیا بات ہے بیٹی ــــ ہر
مہینے آئے گا۔"

نانی اماں اب کبھی مردانے سے گزرتیں تو حقے
اور تمباکو کی مخصوص خوشبو ان کا استقبال نہ کرتی۔ بابا
کی جماہیوں کی آواز سارے میں گونجتی رہتی۔ راتوں کو
بھی جاگنے والے بابا، دن کو بھی اونگھتے رہتے۔ اوپر کے
کام والے چھوکرے نے نانی اماں کو خوش خبری سنائی
"بی بی اماں ــــ بڑے میاں نے تمباکو چھوڑ دیا شاید
دن بھر جماہیاں لیتے اور اونگھتے رہتے ہیں۔"

نانی اماں کو بھلا ایسی ان ہونی بات پر کیسے
یقین آ جاتا۔

اگلے مہینے کی پہلی کو جب پردے کی آڑ سے نانی
اماں نے تنخواہ کے دو روپے بابا کے سامنے رکھے تو ساتھ
ہی یہ بھی پوچھا "رمضان خاں، میں نے سنا ہے تم نے
تمباکو پینا چھوڑ دیا؟"

بابا ہنس دیئے ــــ ایسی ہنسی جو "ہاں" کہلائی
جا سکتی تھی۔

تین دن بعد پوسٹ مین نے دروازے پر آواز
دی ــــ میرے نام منی آرڈر آیا تھا!

سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ نانی اماں تو پڑھی
لکھی تھیں نہیں۔ بڑے بھیا اسکول کا دیا ہوم ورک
کرنے بیٹھے تھے۔ بلائے گئے۔ کوپن پر بھیجنے والے نے
لکھا تھا: "بچی کے سامنے اس کا نام نہ لیا جائے ویسے
پتے سے معلوم تو ہو ہی جائے گا کہ کس نے بھیجا ہے۔
کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ بچی اپنے ہم عمروں کے سامنے

کبھی احساسِ کم تری کا شکار بنے کہ یہ منی آرڈر آیا تو کہاں سے۔"

بڑے بھیا نے بھیجنے والے کا نام نہیں لیا۔ اتنا کہہ دیا کہ اسی شہر سے آیا ہے، کسی دوسرے محلّے سے کوپن میں یہ بھی لکھا ہوا تھا: "میری چھوٹی سی خواہش ہے کہ ننھی بچّی کو اس روپے سے گڑیاں دلا دی جائیں۔ اور ہمیشہ اسی طرح گڑیاں دلادی جایا کریں۔"

اب میں سارے سارے دن ڈیوڑھی میں بابا کے پاس اپنی ڈھیر ساری گڑیاں لیے بیٹھی کھیلتی رہتی، کیونکہ اب بابا کے پاس تمباکو کی بدبو نہ ہوتی۔ میں اتنی ساری گڑیاں دیکھ کر رہ رہ کر خوشی سے کھلکھلا اٹھتی۔ ہر مہینے ان گڑیوں کی گنتی بڑھتی ہی جاتی۔ میں بابا سے خوش ہو کر کہتی "بابا تم نے سچ کہا تھا کہ ابّو مر گئے تو کیا ہوا —— اوپر والا گڑیاں بھیجا کرے گا۔"

پھر ایک دن بابا چلے گئے —— ایسی جگہ جہاں سے پھر کوئی پلٹ کر واپس نہیں آتا۔ اس سے اگلے مہینے پوسٹ مین میرے لیے کوئی منی آرڈر نہیں لایا۔ اور پھر میں، جو اُن دنوں چھٹی جماعت کی ایک سمجھدار اور ہونہار طالبہ تھی، سب کچھ سمجھ گئی۔

میں سمجھ گئی کہ گڑیا دلانے والا، منی آرڈر بھیجنے والا وہ کون تھا۔

وہ اوپر والا تو نہیں تھا —— خدا تو نہیں تھا۔ لیکن خدا ہی کا ایک روپ تھا —— کیوں کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ محبت کرنے والے انسان اپنے خدا کا ہی ایک روپ ہوتے ہیں۔ وہ خدا نہیں ہوتے لیکن خدا کے نیک اور جنتی بندے ضرور ہوتے ہیں۔ ■■

سلام مچھلی شہری

تتلی

رنگ برنگی تتلی آکر بیٹھی ہے پھر پھول پر
خوش ہوکر شاخوں نے چھیڑا
ایک سہانا گیت ہے
چڑیوں نے دیکھا، تتلی سے
پھول کو کتنا پریت ہے
سارا گلشن کتنا خوش ہے
تتلی کے اِس رُوپ سے
لیکن "بھیّا" دُور کھڑے ہیں
صبح کی ٹھنڈی دُھوپ سے
جانے کیوں پھرتے رہتے ہیں، یہ بس مٹّی دُھول پر؟
رنگ برنگی تتلی آکر بیٹھی ہے پھر پھول پر!!
"امّی"، تم نے ٹھیک کہا تھا
"تتلی" بھی اِک "بچّی" ہے
باغ کے پھولوں پر مرتی ہے
خود بھی رنگ برنگی ہے
تم نے یہ بھی ٹھیک کہا تھا
تتلی بِن گُل ہے سُونا
بھول تتلی کو دُکھ ہوگا
پھول کو بھی اب مت چھُونا
بے حد شرمندہ ہوں ماں! میں اپنی پچھلی بھول پر
رنگ برنگی تتلی آکر بیٹھی ہے پھر پھول پر

شکاری رائفل

بلونت سنگھ

یہ ساٹھ سالہ بزرگ نہ لمبے تڑنگے تھے، نہ گورے چٹے، بلکہ اکہرے بدن کے پستہ قد اور قریب قریب کالے رنگ کے انسان تھے۔ اپنا نام شیر محمد خاں بتاتے تھے۔ افغانستان میں اپنے بزرگوں کے کارنامے سینہ پھلا پھلا کر سنایا کرتے تھے۔ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا، انہوں نے شیر کے شکار کا میدان اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔
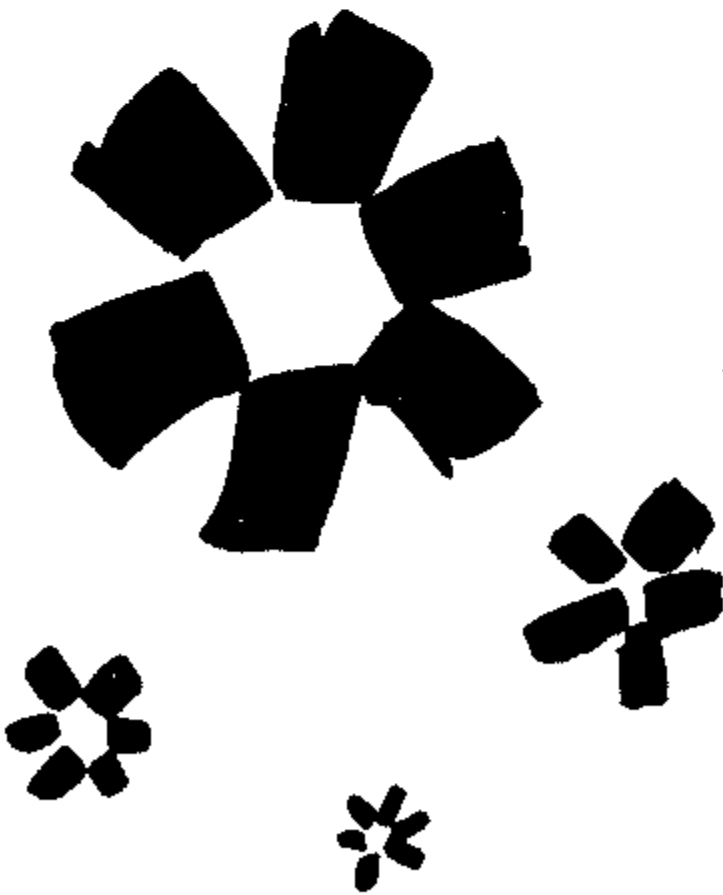
نہ جانے وہ افریقہ کب گئے! دعویٰ یہی تھا کہ وہاں انھوں نے ہاتھی، گینڈے اور جنگلی بھینسے رائفل کی ایک ہی ایک گولی سے مار گراتے تھے۔ ہندوستان کے جنگلوں میں انھوں نے زیادہ تر دھاریوں والے شیروں کا شکار کیا تھا۔ ان کی ناچیز رائے یہ تھی کہ کم از کم شیر کے شکار کے معاملے میں مشہور شکاری جم کاربیٹ (مرحوم) کے علاوہ

ہندوستان میں ان کا ہم پلّہ اور کوئی نہیں تھا۔

ان کی بزرگی کے پیشِ نظر بہت سے لوگ ان کی شیخیوں کو نظر انداز کر کے ان کی باتیں سُن لیتے تھے، لیکن نابالغ لڑکوں پر اُن کے ان معرکوں کا بڑا گہرا اثر پڑتا۔ لڑکے بالے اکثر انہیں گھیرے میں لے کر ان کی باتیں سُنا کرتے تھے۔ اس طرح جناب شیر محمد خاں بچّوں میں 'شکاری انکل' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ کچھ بچّے ایسے بھی تھے جو اُن سے خاص طور پر متاثر تھے۔ ان کے نام تھے گیان چند رشید احمد، بلبیر سنگھ، رشید کی بہن شکیلہ، اور بلبیر کی بہن کلدیپ کور۔ ان میں کسی کی عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ ان کی نظر میں 'شکاری انکل' بہت بڑے ہیرو تھے خود خاں صاحب کو بھی اپنے ان خاص پرستاروں سے گہری محبت تھی۔

بچّوں کے سر پر کسی نہ کسی شوق کا بھوت سوار رہتا ہے۔ "شکاری انکل" کے معرکے سُن سُن کر ان پانچ بچّوں کے ذہن میں خاص طور پر شکار اور شکاریوں کے خیالات منڈلایا کرتے تھے۔ اتفاق سے ان کا چھوٹا سا شہر ایک گھنے جنگل کے کنارے واقع تھا ـــــ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان بچّوں پر دُھن سوار ہوئی کہ جب ان کے انکل ایسے ایسے معرکے سر کر چکے ہیں تو کم سے کم معمولی پیمانے پر تو وہ خود بھی اس قسم کی مہم سر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک سنیچر کے روز انہوں نے جنگل کو جانے کی تیاری کر لی۔ لڑکیوں یعنی شکیلہ اور کلدیپ نے کھانے پینے کا سامان تھیلے میں ڈالا۔ دو تھرموس گرما گرم چائے سے بھر لئے۔ اور لڑکوں نے ہتھیار۔ از قسم چھترے والی ہوائی بندوق، ڈنڈے، چاقو، بلّم وغیرہ کا انتظام کیا۔ گھر والوں سے کہہ دیا کہ آج ہم شکار کھیلنے کو جا رہے ہیں۔ بزرگوں نے ان کی اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ سمجھے کہ زیادہ سے زیادہ یہ بچّے پون میل کی دُوری پر ایک چھوٹے سے جھرنے تک جائیں گے اور اتھلی ندی میں ایک دوسرے پر چھینٹے اڑا کر لوٹ آئیں گے ـــــ لیکن بچّے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔

انہوں نے فلموں میں بھی دیکھا تھا کہ کیسے یورپین شکاری افریقہ کے جنگلوں میں جاتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے قلیوں کی لمبی قطار ہوتی ہے جو شکاریوں کا سامان اٹھاتے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں وہ اپنا مختصر سامان خود ہی اٹھانے پر مجبور تھے۔ دراصل اتنا سامان بھی نہیں تھا کہ انہیں نوکر کی ضرورت محسوس ہوتی۔

کھاتے پیتے اور ترقی پسند خاندانوں کے یہ بچّے سہ پہر کو گھر سے روانہ ہوتے۔ جھرنے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ لیکن آج ان کی منزل بہت آگے تھی جنگل کے اونچے اونچے پیڑ انہیں اشاروں سے بُلا رہے تھے ننھے شکاری جوش میں بھرے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے آخر وہ جنگل کے بالکل کنارے پر پہنچ گئے۔ ابھی سورج ڈوبنے میں کافی دیر تھی، لیکن قریب سے جنگل کی اندرونی تاریکی دیکھ کر لڑکیاں کچھ سہم گئیں۔ کلدیپ نے کہا "میرے خیال میں آج کے شکار کا پروگرام بس یہیں تک رہنا چاہئے۔ اب کچھ کھا پی کر ہم لوٹ چلیں تو ٹھیک رہے گا۔"

شکیلہ نے بھی جھٹ سے اپنی سہیلی کی حمایت کی۔ اس پر رشید برہم ہو کر بولا "بس ان عورتوں میں یہی تو خرابی ہے، بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں، کسی مہم میں مردوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ میرے خیال میں ہمارے شکاری انکل کبھی کسی عورت کو شکار پر اپنے ساتھ نہیں لے جاتے تھے!"

دس ساڑھے دس برس کی ان لڑکیوں کو 'عورت'

کہنا اور رشید کا اپنے جیسا لوں مرد بنا بڑی مضحکہ خیز بات تھی۔ لیکن وہ دونوں کوئی نہ کوئی معرکہ سر کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بلبیر نے خفگی بھری نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ گیان چند دل میں تو محسوس کرتا تھا کہ لڑکیوں کی رائے پر غور کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں، مگر اپنے ساتھیوں کے ڈر سے وہ خاموش رہا۔ اسے اس بات کا بھی خوف تھا کہ کہیں اس کی مردانگی خطرے میں نہ پڑ جائے۔

آخر عورتوں کی ہار ہوئی اور مردوں کا بول بالا ننھے شکاریوں نے جنگل کے اندر قدم رکھ دیا۔

تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دائیں بائیں سے پرندوں کی درندوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لڑکیاں اور بھی سہم اور سمٹ کر لڑکوں کے پیچھے پیچھے ہولیں دل تو لڑکوں کے بھی دھڑکنے لگے لیکن وہ اپنے اپنے ہتھیار سنبھالے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔

نہ جانے کتنی دور تک جاکر یکایک لڑکیوں کے حلق خشک ہوگئے، یا کم از کم انھوں نے اس بات کا اعتراف کرلیا۔ طے پایا کہ جنگل میں ایک زمین کے ایک ذرا صاف ٹکڑے پر بیٹھ کر وہ چائے پی لیں۔ اس جگہ صرف گھاس تھی۔ چاروں طرف پیڑ اور جھاڑیاں تھیں۔ وہاں پر چائے پینے میں بھی کس قدر لطف انگیز سنسنی کا احساس ہورہا تھا نہیں! چائے کے ساتھ جو کھانے پینے کا سامان تھا وہ بھی ختم کردیا گیا تاکہ ان کا فالتو بوجھ کم ہوجائے۔

اس کام سے فرصت ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ جنگل میں اندھیرا چھانے لگا ہے۔ ویسے پیڑوں کے اوپر آسمان بے حد روشن دکھائی دے رہا تھا۔ گیان چند نے کہا "میرے

ڈراؤنی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ......

خیال میں جنگل کے باہر ابھی کافی روشنی ہوگی۔ لیکن جنگل میں جلد ہی گہرا اندھیرا چھا جائے گا۔ بہتر یہی ہوگا کہ اب ہم لوٹ چلیں۔ جنگل میں رات ہوگئی تو ہم جنگلی جانوروں میں گھِر کر رہ جائیں گے۔"

ابھی تک ان کے شکار کا معرکہ صرف اتنا رہا تھا کہ انھوں نے جانوروں کی بس مبہم سی آوازیں سنی تھیں۔ لیکن ایک رائے ہوکر سب نے واپسی ہی کو مناسب سمجھا مشکل یہ تھی کہ وہاں کوئی خاص راستہ تو تھا نہیں۔ اس لئے وہ جنگل میں بھٹکنے لگے۔ کبھی ایک سمت کو بھاگتے اور کبھی دوسری جانب کو۔

اتنے میں اچانک بڑے زور کی غراہٹ سنائی دی۔ اور اس کے بعد قریب ہی سے اس قدر بھیانک شور اٹھا

جیسے دو جانور آپس میں لڑ رہے ہوں۔ سب بچے جھاڑیوں میں دبک گئے۔ لڑنے والے جانور انہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے، البتہ اُن کے ایک دوسرے پر جھپٹنے، چلّانے، چیخنے اور غرّانے کی آوازوں کے باعث سب بچّوں کے دل کانپ اُٹھے۔

خدا خدا کرکے وہ شور کم ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ جانور کہیں دُور چلے گئے۔ اب بچے پھر بھاگے۔ کافی دیر تک دوڑ بھاگ کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ پیڑوں کے اوپر آسمان میں تارے جھلملانے لگے ہیں تو انہوں نے طے کیا کہ اب انہیں کسی اونچے پیڑ پر چڑھ جانا چاہئے ورنہ کوئی نہ کوئی درندہ انہیں دبوچ لے گا۔ بڑی دقّت سے وہ سب ایک پیڑ پر چڑھ گئے۔

رات گہری ہونے لگی۔ جنگلی جانوروں کا شور بڑھنے لگا —— یہاں تک کہ شیر کے دھاڑنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان کے لئے تو گیدڑوں کی ہُوا ہُو ہی کافی تھی وہ رات کس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی، اس کا بیان نہیں ہو سکتا —— خیر! جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو اُن کی جان میں جان آئی۔ تب انہیں پتہ چلا کہ وہ جنگل کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ اور اگر رات کو ذرا اور آگے بڑھ جاتے تو جنگل کے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے۔

وہ نیچے اترنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ پیڑ کے نیچے والی جھاڑیوں میں کچھ شور ہوا —— انہیں مٹیالے رنگ —— کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ گیان چند نے کہا کہ ان جھاڑیوں میں شیر گھس آیا ہے۔ بھلا اب انہیں نیچے اُترنے کی ہمت کیسے ہوتی۔

اُدھر گھر والوں کی پریشانی کی کوئی حد ہی نہ رہی تھی پچھلی شام اندھیرا ہونے تک تو انہیں اطمینان تھا، لیکن اس کے بعد بچّوں کی تلاش زور شور سے شروع ہو گئی۔ جنگل میں گھسنا بے کار تھا، اور اس کے باہر بچّوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سُورج کی پہلی کرن کے ساتھ کئی آدمی جنگل میں گھس پڑے

پیڑ پر دم بخود بیٹھے ہوتے بچّوں کو اچانک 'شکاری انکل' دکھائی دئے۔ وہ چِلّا چِلّا کر انہیں آوازیں دینے لگے۔

'شکاری انکل' نے پیارے بچّوں کی آوازیں سُنیں تو فوراً اُن کی طرف بھاگے۔ ان کے ہاتھ میں پُرانے زمانے کی گھوڑے والی دونالی بندوق تھی۔ پیڑ پر سے کوئی بچہ چلّایا "انکل ذرا سنبھل کر۔ پیڑ کے نیچے جھاڑیوں میں شیر چُھپا بیٹھا ہے۔"

یہ سُنتے ہی انکل اباؤٹ ٹرن ہو کر سرپٹ بھاگے۔ یہ منظر دیکھ کر بچّوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ انہوں نے پھر انکل کو پکارا۔ انکل گھبراہٹ میں دوسرے پیڑ پر چڑھ گئے۔ بشیر نے زور سے آواز دی "انکل جھاڑیوں میں گولی مار دیجئے۔ شیر مر جاتے گا۔"

'شکاری انکل' کا دَم خشک ہو رہا تھا۔ اگر بچے اُن سے اتنی دُور نہ ہوتے تو اُن کی بوکھلاہٹ دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ اب رشید نے للکار کر انہیں گولی چلانے کو کہا۔ اُدھر انکل جلدی میں ہوائی فائر کر گئے۔ یعنی گولی جھاڑی کی طرف جانے کی بجائے آسمان کی جانب اُڑ گئی۔

بندوق کے شور سے ایک قسمت کا مارا گدھا، جو جھاڑیوں میں پناہ گزیں تھا، فرار ہو کر بھاگا۔

یہ دیکھ کر سب کے دَم میں دَم آیا۔ وہ پیڑوں سے اُتر پڑے۔ 'شکاری انکل' سب بچّوں کی رہنمائی کرتے فتح کے جھنڈے اُڑاتے شہر کو لوٹ آتے۔

جھاڑیوں میں اگرچہ صرف ایک گدھا دُبکا ہوا تھا لیکن سب بچّوں میں 'شکاری انکل' کے اس معرکے کے چرچے بھی کئی دن تک ہوتے رہے۔

■■

رام لعل

ایک سچی کہانی

میرے بچّوں کی خواہش تھی کہ میں انہیں کوئی سچی کہانی سناؤں۔ اللّو، اٹّو اور ہاتیہ، تینوں مجھ سے اکثر کہانی سنانے کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔ جب بھی وہ مجھے اچھے موڈ میں دیکھتے تو اکثر رات کو سونے سے پہلے ان کی ضد شروع ہو جاتی۔ جب میں اپنے موکّلوں سے جلدی نجات پا جاتا یا اُن کے مقدموں کی فائلیں بہت رات گئے تک نہ دیکھتا رہتا تو وہ سمجھتے کہ اُن کی فرمائش پوری ہونے کا یہی وقت ہے

لیکن میرے بچّے جب بھی مجھ سے کوئی کہانی سنانے کی فرمائش کرتے تو اُن کی ممّی فوراً اُنہیں جھڑکنے لگتی، تمہارے ڈیڈی آج بہت تھکے ہوئے ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو؛ انہیں سونے دو۔ کل دن بھر عدالت کے سامنے نہ جانے کس کس کے مقدمے کے لئے اُنہیں بحث کرنی ہوگی۔ چلو تم بھی سو جاؤ۔"

لیکن بچّے اپنی ممّی کی بات کبھی نہیں مانتے تھے جب تک وہ مجھ سے ایک نئی کہانی نہ سُن لیتے، سونے کا نام

نہیں لیتے تھے۔ یہ سچ تھا کہ مجھے نیند کی سخت ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنے بچّوں کو کبھی ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سُنا دیتا، اگرچہ ہر کہانی سناتے وقت مجھے ہمیشہ ہی سوچنا پڑتا کہ اب نئی کہانی کہاں سے لاؤں؟

عام طور پر میں اپنے مقدموں میں سے جن کی میں پیروی کیا کرتا تھا، واقعات کو توڑ موڑ کر ایک کہانی نکال لیا کرتا تھا۔ لیکن جب بچّوں نے یہ فرمائش کی کہ کوئی سچی کہانی سناؤں تو میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

تینوں بچّے نائٹ سوٹ پہنے ہوئے میرے پلنگ کے پاس مونڈھوں پر بیٹھے تھے۔ میں بھی اپنے نائٹ سوٹ کے اوپر سلیپنگ گاؤن پہنے پلنگ کی پٹی پر جما ہوا تھا۔ اُن کی ممّی کچن میں ہم سب کے لئے دودھ گرم کر رہی تھی۔ کچن میں گیس جلنے کی آواز ہم سب کو سنائی دے رہی تھی۔ آلو نے کسی قدر فکر مند ہو کر کہا، "ڈیڈی جلدی کیجئے نا۔ نہیں تو ممّی آکر ہم سب کو ڈانٹ کر بھگا دیں گی۔"

اُتو اور ہاتیہ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا، ہاں ڈیڈی جلدی کیجئے۔ پتہ نہیں ہماری ممّی کو کہانی سننا کیوں اچھا نہیں لگتا؟ وہ تو کہانی کے نام سے ہی چڑ جاتی ہیں!"

کہانی کے نام پر چڑنے کی بات سُن کر مجھے واقعی ایک سچی کہانی یاد آگئی۔ میں نے بچّوں کو اور قریب کر کے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا، دو بھائی ایک گھر میں رہتے تھے۔ ایک بڑا تھا۔ دوسرا چھوٹا۔ بڑے کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ وہ ایک دفتر میں کام کرتا تھا، اور کچھ تنخواہ لے آتا تھا۔ لیکن چھوٹا بھائی کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ اُسے تمہاری طرح کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اسے خود بھی بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ ایک سے ایک اچھی کہانی۔ جب اس کے گھر میں بھابی آگئی تو اس نے چاہا کہ اپنی بھابی کو بھی کہانیاں سنایا کرے اور بدلے میں اُس سے بھی کہانیاں سُنا کرے۔ لیکن اُس کی بھابی کو نہ تو کہانی سُننا ہی بھاتا تھا، نہ کہانی سنانا۔ وہ جب بھی کہانی کی بات شروع کرتا، بھابی اُسے جھڑک دیتی اور اُسے نکھٹو کہہ کر اپنے پاس سے اُٹھا دیتی۔

"جب اُس کا پتی گھر آتا تو وہ اُس کے چھوٹے بھائی کے خلاف شکایتیں کرتی۔ یہاں تک کہہ دیتی کہ ایسے نکھٹو کو گھر میں رکھ کر مُفت کھلانا پلانا مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔ اس پر اُس کا پتی اُسے سمجھاتا۔" وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس کا من کوئی کام کرنے میں نہیں لگتا تو کوئی بات نہیں۔ کبھی نہ کبھی تو کام میں جی لگائے گا ہی۔ ابھی اُسے کچھ نہ کہو۔ ایک آدمی کو کھلانے پلانے پر خرچ ہی کتنا آتا ہے۔ اُس کا خرچ ہم آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں۔

"لیکن وہ عورت کسی طرح نہیں مانتی تھی۔ ہمیشہ ہی ضد کر کے بیٹھ جاتی: اپنے چھوٹے بھائی کو گھر سے نکال دو۔

"ایک روز چھوٹے بھائی نے اپنی بھابی کے مونہہ سے یہ بات سُن لی۔ اس کا من بہت دُکھا۔ اُس نے اُسی روز گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا، اور سچ مچ کہیں چلا گیا۔

بڑے بھائی کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اُس کے بغیر وہ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو تلاش کرانے کے سارے جتن کر ڈالے۔ اخباروں میں اُس کا فوٹو چھپوا کر انعام دینے کا اعلان کیا۔ ریڈیو سے اُس کا حلیہ نشر کرایا۔ کئی بڑے بڑے شہروں میں پوسٹر چھپوا کر دیواروں پر لگوا دیئے۔ لیکن چھوٹے بھائی کا

کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر وہ تھک ہار کر خاموش ہو رہا۔ قسمت پر بھروسہ کر کے سوچا، کبھی نہ کبھی تو وہ مل ہی جائے گا—— اگر اس سے ملنا نصیب میں ہوگا۔

اپنے "دیور کے غائب ہو جانے کے بعد اس کی بھابی کو اپنے کئے پر افسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھیرایا اور اپنے پتی کے سامنے رونے لگی۔ لیکن اُس کے پتی نے اسے معاف کر دیا اور کہا "آئندہ اس کے ساتھ ایسا بُرا برتاؤ کبھی نہ کرنا۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس آجائے گا۔"

"اُس کی پتنی نے وعدہ کر لیا کہ اگر وہ سچ مچ واپس آجائے گا تو وہ اُسے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح رکھے گی اور اس کو کبھی بھول کر بھی نہیں کوسے گی۔

"لیکن کتنے ہی سال گذر گئے، چھوٹا بھائی واپس نہیں آیا اُس کی بھابی اور بڑا بھائی دُکھی رہتے تھے۔ جب کبھی اس کی یاد آجاتی تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ انھوں نے اُس کے کپڑے اور کئی دوسری چیزیں سنبھال کر ایک بکس میں رکھی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی نکال کر دیکھ بھی لیتے تھے—— اُسے یاد کرنے کے لئے۔"

میں ابھی یہاں تک کہانی سنا پایا تھا کہ اچانک میری نظر اپنی بیوی پر گئی۔ وہ دروازے کے پاس ایک ٹرے میں دودھ کے پیالے لئے کھڑی تھی۔ مجھے اُس کی طرف دھیان دیتے دیکھ کر بچّوں نے بھی گردن گھما گھما کر اپنی ممی کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے! کچھ لمحوں تک وہ بالکل چپ بیٹھے رہے۔ انہوں نے میری طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ممّی کے پاس چلے گئے۔ اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر تپائی پر رکھ دی اور ممّی کو اندر لے آئے۔

ان کی ممّی نے آنسو پونچھ کر مجھ سے کہا، "کیا آپ نے ابھی تک مجھے سچّے دل سے معاف نہیں کیا تھا؟ نہیں کیا تھا نا؟ ورنہ آج بچّوں کو یہ بات کیوں بتاتے؟ لیکن میں اپنے قصور کے لئے بڑی سے بڑی سزا بھگتنے کے لئے تیّار ہوں—— آپ جو بھی سزا مجھے دینا چاہیں!"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں شرمندہ سا ہو کر بولا" میں تو کبھی بچّوں کو ایک کہانی سُنا رہا تھا۔ لیکن میں نے تمہیں قصوروار تھوڑا ہی ٹھہرایا ہے۔ بے شک پوچھ لو بچّوں سے۔ میں نے تو کہا ہے کہ اس کی بھابی بھی اُس کے چلے جانے کے بعد بے حد دکھی تھی۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم واقعی بہت دکھی رہتی ہو۔ جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ جو خود کبھی کہانیاں سنایا کرتا تھا اب وہ واقعی ہمارے لئے ایک کہانی ہی بن کر رہ گیا ہے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے آنسو پونچھ دئے۔ انو، اتّو اور ہاتیہ، تینوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اُن کے بھی آنسو پونچھ ڈالے اور سب کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھما دیا۔

سب نے خاموشی سے دودھ پی لیا۔ میری طرف گہری نظروں سے بھی دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی ممّی کی طرف بھی ایسی ہی نظروں سے دیکھ لیتے۔

جب میں اُنہیں اُن کے کمرے میں سلانے کے لئے لے گیا تو ہاتیہ نے میرا بازو پکڑ کر بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا، "ڈیڈی ڈیڈی، آپ نے ہمیں جس چھوٹے بھائی کی سچی کہانی سنائی ہے، وہ ہمارا انکل تھا نا؟"

بچے ٹھیک سمجھ گئے تھے۔ وہ اُن کا انکل ہی تھا میں نے انکار نہ کیا تینوں کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا، ہاں، سچ مچ تمہارا انکل

فلمی گانوں کی آوازیں آرہی ہیں معلوم ہوتا ہے آپ نے غلطی سے کوئی ٹرانسسٹر نگل لیا ہے

تھا۔ لیکن تم لوگ اُسے بھول جاؤ۔ اور پھر مجھے کبھی یہ کہانی سنانے کے لئے نہ کہنا۔ سمجھے!"

جب میں اُنہیں اپنے اپنے پلنگ پر لٹا کر لائٹ آف کرنے لگا تو اَنّو نے کہا، "ڈیڈی، کیا انکل کبھی واپس نہیں آئیں گے؟"

میں نے کہا، "میں نہیں جانتا۔ شاید کبھی آجائے۔ میں تو ہمیشہ اُس کا انتظار کرتا رہتا ہوں۔"

اَنّو نے کہا، "ڈیڈی، کل صبح ہمیں انکل کے کپڑے اور دوسری چیزیں دکھائیے گا! جو آپ نے ایک بکس میں بند کرکے رکھی ہوئی ہیں!"

میں نے ان سے وعدہ کرلیا "ہاں دکھادوں گا۔ لیکن ایک شرط پر۔ اپنی ممی سے اُس کے بارے میں کبھی کوئی سوال نہ کرنا۔ اُس کے دل پر بہت چوٹ پڑتی ہے جب بھی تمہارے انکل کا ذکر اُس کے سامنے آتا ہے۔ اور اب سو جاؤ۔ اس کے بعد کوئی بھی بات نہ پوچھو۔ سمجھے۔ گڈ نائٹ!"

تینوں بچوں نے بہت ہی آہستہ سے 'گڈ نائٹ' کہا۔

میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

اگلے روز میں نے اپنی بیوی سے چھپا کر تینوں بچوں کو ان کے انکل کے کپڑے اور دوسری چیزیں دکھائیں۔ اُسی بکس میں اُس کا فوٹو بھی رکھا ہوا تھا۔ ان دنوں وہ اٹھارہ سال کا تھا۔ بہت ہی خوب صورت اور بھولا بھالا۔ بچے اپنے انکل کی تصویر دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ ضد کرنے لگے کہ اس تصویر کو فریم میں لگوا کر دیوار پر لٹکا دیا جائے۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ انہیں یاد دلایا "اسے دیکھ کر تمہاری ممی کا دل اور دکھی ہوگا۔"

اگلے سال ہم سب کا پروگرام شملہ جانے کا بن گیا۔ ہم ہر سال گرمیوں میں کسی نہ کسی پہاڑ پر ضرور جایا کرتے تھے۔ عام طور پر جہاں جاتے اپنی گاڑی سے ہی جاتے تھے۔ اپنی کار میں یہ سہولیت رہتی ہے کہ جہاں دل چاہتا ہے اُسے روک لیا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں ہردوار میں کنبھ کا میلہ تھا لاکھوں یاتری بسوں، موٹروں اور گاڑیوں میں بھرے ہوئے اس طرف جارہے تھے، سہارن پور کے پاس ہماری گاڑی اچانک خراب ہوگئی۔ اس کی مرمت کے لئے ہم کچھ آدمیوں کی مدد سے اسے دھکیل کر شہر کے باہر گرانڈ ٹرنک روڈ پر ایک پٹرول پمپ تک لے آئے۔ وہیں کاروں کی مرمت کا کام بھی ہوتا تھا۔ وہاں ہمیں گھنٹہ بھر رکنا پڑا۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ پیاس کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ کھوپڑی پگھلتی ہوئی سی لگتی تھی۔ لیکن اس سڑک پر بے شمار یاتری موٹروں اور بسوں کے علاوہ پیدل بھی چلتے جارہے تھے۔ اتنی سخت دھوپ میں بھی گنگا مائی کی جے کے نعرے لگاتے ہوئے۔

بچّے اُن سب کی طرف بڑی دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک انہیں پیدل جانے والے یاتریوں میں ایک ادھیڑ عمر کا لمبے لمبے سفید بالوں اور ڈاڑھی والا ایک ایسا آدمی دکھائی دے گیا جس کے کندھے پر بچّوں کا بائیسکوپ رکھا ہوا تھا۔ بائیسکوپ دیکھ کر بچّے مچل گئے ”ہم بائیسکوپ دیکھیں گے! بائیسکوپ دیکھیں گے!!

انہیں اُن کی ممّی نے جھڑک دیا تو وہ مونہہ بناتے ہوئے میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ اس وقت میں پیٹرول پمپ کے منیجر کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اُنہیں ٹالنے کے لئے میں نے کہہ دیا ”جاؤ جاؤ دیکھو“

یہ سن کر بچّے خوش ہو کر اس آدمی کی طرف بھاگے اور اسے روک کر بائیسکوپ کا تماشا دکھانے کے لئے کہا۔

وہ کوئی بہت بھلا آدمی تھا۔ نہ جانے کس دھن میں یاتریوں کے قافلے کے ساتھ چلا جارہا تھا۔ بچّوں کی ضد کے سامنے وہ انکار نہ کرسکا، اور ایک پیڑ کا سایہ دیکھ کر انہیں وہاں لے گیا اس نے زمین پر اسٹینڈ رکھا اور اس پر لکڑی کا بکس رکھ کر اُنہیں تصویریں دکھانے لگا ——

گھومتی ہوئی رنگین تصویریں جنہیں وہ خود ہی ایک ہینڈل کے ذریعے گھماتا تھا۔ بچّے الگ الگ سوراخوں سے آنکھیں لگائے جھک کر کھڑے بڑے اشتیاق سے تصویریں دیکھ رہے تھے اور بائیسکوپ والے کا دل چسپ گانا بھی سنتے جارہے تھے۔

اُس کے گانے کی آواز مجھ تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس کا گانا اُن سب تصویروں کے بارے میں تھا۔ تصویریں ملک کے مشہور شہروں اور جگہوں کی تھیں —— دلّی کا قطب مینار، لال قلعہ، پارلیمنٹ ہاؤس، چھبیس جنوری کا جلوس، تاج محل، بنارس کے گھاٹ، بنگال کا ہوڑا برج، سوم ناتھ کا مندر، شیر شاہ سوری کا مزار، مہاتما بدھ کی مورتی ....

اس کے وکیل کو بلا دو وہ آپریشن کے پہلے وصیت نامہ لکھوانا چاہتا ہے!

میرے کانوں تک اُس کی آواز بہت ہلکی ہلکی پہنچ رہی تھی۔ آواز بے حد سریلی تھی۔ لیکن میں اپنی باتوں میں کھویا ہوا تھا۔ بچّوں کو اچانک اُن کی ممّی نے کوکا کولا پینے کے لئے پکارا تو وہ بھاگ کر آگئے۔ اپنی اپنی بوتل لے کر وہ بائیسکوپ والے کے لئے بھی ایک بوتل لے گئے۔ اور بائیسکوپ والے کو تماشا دکھانے کے معاوضے میں مجھ سے ایک روپیہ لے کر گئے تو اُس نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ میری بیوی نے خود جاکر اُسے پیسے لے لینے کے لئے کہا تب بھی اُس نے پیسے نہیں لئے۔ اور پھر وہ وہاں سے اپنا بائیسکوپ اُٹھا کر چل دیا اور یاتریوں کے پیدل چلنے والے قافلے میں کھو گیا۔

جب ہم اپنی موٹر ٹھیک کرا کے شملہ کی طرف پھر روانہ ہوگئے تو اچانک میری بیوی نے کہا ”اس آدمی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل میں بار بار یہ خیال اُٹھ رہا ہے کہ وہ آپ کا چھوٹا بھائی تھا —— اُسی کی طرح ماتھا اور آنکھیں، اور وہی بولنے کا ڈھنگ۔ لیکن اُس کی شکل

اتنی عجیب و غریب سی! یقین بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا
کہ وہ وہی ہوگا!"

اُس کی بات سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ میں نے
تو اُسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دُور بیٹھے بیٹھے اُس کی آواز ہی
سنی تھی جو میٹھی بھی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میرا چھوٹا بھائی
اس طرح تو کبھی نہیں گایا کرتا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا "کیا اُس نے بھی تمہیں نہیں
پہچانا؟"

وہ بولی "میرا خیال ہے اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔
تب ہی تو میری طرف اور بچوں کی طرف بھی بڑی دلچسپی سے
دیکھ رہا تھا اور بڑی اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔"

انُو نے ہماری باتیں سن کر کہا "ڈیڈی، ڈیڈی! اُس
آدمی نے مجھ سے میرا نام بھی پوچھا تھا اور آپ کا نام بھی!"

"کیا سچ؟" میں نے گاڑی کو اچانک بریک لگا کر پوچھا۔

"ہاں ڈیڈی۔ میں نے آپ کا نام بتایا تو وہ کچھ سوچ
میں پڑ گیا۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ وہاں سامنے
پٹرول پمپ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"پھر، پھر اُس نے کیا کہا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا
انُو بولا "کچھ نہیں۔ آپ کی طرف وہیں کھڑے کھڑے
ہی تکتا رہا۔"

"تم اُسے میرے پاس لے کیوں نہیں آئے بیٹا؟"
میرا دل یک بیک ایک عجیب سے درد سے بھر گیا، اور میں اپنی
بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو لہرا رہے تھے۔
اُس نے کہا "شک تو مجھے اُسی وقت ہو گیا تھا جب اُس نے
مجھ سے پیسے لینے سے انکار کر دیا لیکن پتہ نہیں میری ہمت
کیوں جواب دے گئی! میں اُس سے پوچھ ہی نہ سکی۔ ڈرتی تھی
کہ کہیں وہ نہ ہو کوئی اور ہی ہو! لیکن جب وہ چلا گیا ہے
تو میرا دل بے اختیار اُسی آدمی کی طرف کھنچ رہا ہے۔
مجھے یقین ہے وہ وہی ہوگا!" یہ کہہ کر پھر رونے لگی۔

انُو، اُتو اور راتیہ تینوں پیچھے کی سیٹوں سے اٹھ کر
میرے کندھوں پر جھک گئے۔ بولے "ڈیڈی" گاڑی گھمائیے!
انکل کو جا کر لے آئیں۔ وہ بہت دُور نہیں گئے ہوں گے!"
میری بیوی نے بھی یہی رائے دی۔ واپس جا کر اُس
آدمی سے پوچھ لیا جائے۔ کیا پتہ وہ وہی ہو!

میں نے گاڑی گھمائی —— اگرچہ ہم پندرہ بیس میل
سہارنپور سے دُور آ چکے تھے اور وہ آدمی بھی پیدل چلتے چلتے اتنی
دیر میں ایک آدھ میل تو ضرور ہردوار کی طرف آگے بڑھ گیا ہوگا
جہاں کنبھ کے میلے میں لاکھوں یاتری جا رہے تھے۔

میں ایک عجیب سی کشمکش میں گاڑی کو واپس بھگاتا ہوا
لے گیا۔ سہارن پور جا کر گاڑی کو ہردوار جانے والی سڑک پر
ڈال دیا۔ اس سڑک پر کئی بسیں اور ٹرک جا رہے تھے۔ سڑک
کے دونوں طرف یاتریوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ اُن کا
شور تھا۔ میں اور بچے اور ان کی ممّی کھڑکیوں سے باہر سر نکال
کر کتنی دور تک دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ ہزاروں یاتریوں
کو گھور گھور کر دیکھا اور ان کے درمیان کسی ایسے آدمی کو
ڈھونڈنے کی کوشش کی جس کے لمبے سفید بال اور داڑھی ہو
اور کندھے پر بائیسکوپ کا بکس بھی ہو۔ لیکن ہمیں انتہائی کوشش
کے باوجود اُس قسم کا آدمی نظر نہ آیا۔ تلاش کرتے کرتے شام
ہو گئی۔ سورج ڈھلنے پر آ گیا۔ ہم تو رڑکی سے بھی بہت آگے
تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں تک کوئی بھی آدمی اتنی تیزی سے
پیدل چل کر نہیں جا سکتا تھا۔ مایوس ہو کر ہم واپس چل پڑے
واپسی پر بھی دونوں طرف اسے تلاش کرتے گئے۔ لیکن وہ کہیں
بھی دکھائی نہ دیا نہ جانے وہ اس بھیڑ میں سے نکل کر کہاں چلا گیا
تھا۔ اُس کے بعد آج تک وہ ہمیں دکھائی نہیں دیا ہے ■■

لاڈلی

پریم وار برٹنی

مری لاڈلی میری پیاری اجنتا   ہمالہ کی بیٹی، گگن کی دُلاری
یہ ننھی سی گنگ و جمن کی چہیتی   مری اور میرے وطن کی دُلاری

وطن میں مرا نام اونچا کرے گی   دِلآویز خوابوں کی تعبیر ہے یہ
یہ میری کلا کی سُنہری کرن ہے   مرے ہر تصوّر کی تصویر ہے یہ

یہ میرے خیالوں کی خوشبو ہے جس نے   ہزاروں بہاروں کے دِل گُدگُدائے
عجب مُسکراہٹ ہے ننّھے لبوں پر   جسے چُومتے ہیں فرشتوں کے سائے

بکھرتے نظاروں کی شہزادیوں نے   مچل کر گلے سے لگایا ہے اس کو
ستاروں نے ہنس کر سُنائی ہے لوری   ہواؤں نے جھولا جُھلایا ہے اس کو

یہ چاند اور سُورج کھلونے ہیں ان کے   یہ جُھومے انہیں اپنی باہوں میں لے کر
لڑکپن کے معصوم خوابوں سے کھیلے   محبّت کو ننّھی سی باہوں میں لے کر

یہ ننّھی سی رادھا یہ چھوٹی سی سیتا   سُنائے گی پیغام انسانیت کا
مِٹائے گی ظلم و سِتم کے اندھیرے   چمک جائے گا نام انسانیت کا

دل و جاں نچھاور کرے گی وطن پر   اَمر زندگی کی کہانی بنے گی!
مری لاڈلی میری پیاری اجنتا   بڑی ہو کے جھانسی کی رانی بنے گی

نیا کھیل

کنہیا لال کپور

اصغر کو نئے نئے کھیل ایجاد کرنے میں مزہ آتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "آج ہم ڈاکٹر اور مریض کا کھیل کھیلیں گے۔

گوپال نے پوچھا "یہ کھیل کیسے کھیلا جاتا ہے؟"

اصغر نے جواب دیا "یہ بہت آسان اور دلچسپ کھیل ہے۔ میں ڈاکٹر بنوں گا، تم کمپاؤنڈر۔ ہریش، امجد بلونت مدن اور اکبر مریض ہوں گے۔ وہ باری باری ہمارے پاس آئیں گے اور ہم ان کے امراض کی تشخیص کرنے کے بعد علاج تجویز کریں گے۔ اچھا تو اب کھیل شروع ہوتا ہے۔"

اصغر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور گوپال کو اشارہ کیا کہ پہلے مریض ہریش کو اسٹول پر بیٹھنے کے لئے کہے:

اصغر : ہاں صاحب۔ آپ کو کیا شکایت ہے؟

ہریش : مجھے بہت بولنے کا مرض ہے۔

اصغر : یعنی آپ ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتے رہتے ہیں۔

دکان بند ہو گئی ہے ـــــ اب دو گھنٹے بعد کھلے گی

ہرلیش : جی ہاں ، یہاں تک کہ خواب میں بھی بڑبڑاتا رہتا ہوں ۔

اصغر : ذرا اپنی زبان دکھایئے ۔

(ہرلیش زبان دکھاتا ہے)

اصغر : یہ زیادہ لمبی تو نہیں ہے ؟

ہرلیش : جی نہیں ، دو یا ڈھائی انچ ہے ۔

اصغر : آپ کبھی کچھ سوچتے بھی ہیں ؟

ہرلیش : بالکل نہیں ۔

اصغر : وجہ ؟

ہرلیش : باتیں کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی ۔ سوچوں کس وقت ۔

اصغر : عموماً آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ؟

ہرلیش : فضول سی باتیں ۔

اصغر : ان سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا ہے ؟

ہرلیش : کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔

اصغر : کیا سننے والوں کو مزا آتا ہے

ہرلیش : نہیں وہ تو اکثر بور ہو جاتے ہیں ۔

اصغر : پھر آپ یہ عادت چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟

ہرلیش : کئی بار کوشش کی ہے ، لیکن چھوٹتی نہیں ۔

اصغر : اچھا میں آپ کو ایک آسان علاج بتاتا ہوں ۔

ہرلیش : فرمایئے ۔

اصغر : ایک علی گڑھ کا تالا لے کر اپنے مونہہ کو لگا دیجئے ، اور چابی کنوئیں میں پھینک دیجئے ۔

گوپال : مطلب یہ کہ نہ ان کا مونہہ کھلے گا ، نہ یہ باتیں بنائیں گے ۔

ہرلیش : کیا علی گڑھ کا تالا آپ سے مل جائے گا ۔

اصغر : جی نہیں ، ہم ڈاکٹر ہیں ، تالے نہیں بیچتے ۔

اب امجد کی باری تھی ۔ اسے ڈاکٹر صاحب کو بتایا میرا پڑھنے لکھنے میں جی نہیں لگتا ۔

اصغر : یہ شکایت آپ کو کب سے ہے ؟

امجد : ایک سال سے

اصغر : وجہ ؟

امجد : مجھے پڑھنے لکھنے سے نفرت ہے ۔

اصغر : کیوں نفرت ہے ؟

امجد : یہ میں نہیں کہہ سکتا ۔

اصغر : ہم بتائے دیتے ہیں ۔

امجد : کہیے ۔

اصغر : نفرت عموماً ڈر یا خوف سے پیدا ہوتی ہے ۔

امجد : آپ کا مطلب ہے میں ڈرپوک ہوں ۔

اصغر : جی ہاں ۔

امجد : یہ بالکل غلط ہے میں کسی سے نہیں ڈرتا ۔

اصغر : آپ اپنے کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

امجد : تو گویا میں واقعی کسی چیز سے ڈرتا ہوں ۔

اصغر : جی ہاں ، اور وہ چیز ہے تعلیم ۔

امجد : مجھے اس خوف سے کس طرح چھٹکارا مل سکتا ہے ۔

اصغر : دیکھئے ، آپ پر ہمیشہ خوف سوار رہتا ہے ۔ آپ

خوف پر سوار ہو جائیے۔

امجد : واہ، کیا خوف بھی کوئی جانور یا سائیکل ہے جس پر سوار ہو جاؤں۔

اصغر : اگر آپ سواری سے گھبراتے ہیں تو پھر ایک اور طریقہ آزمائیے۔

امجد : وہ کیا؟

اصغر : خوف کو حکم دیجئے کہ وہ آپ کے دماغ سے نکل جائے۔

امجد : کیا ایسا کرنے سے وہ چلا جائے گا؟

اصغر : کیوں نہیں۔ آخر دماغ آپ کا ہے اس کا تو نہیں اگر آپ اسے وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیں گے تو وہ کیسے رہ سکتا ہے۔

امجد : اگر وہ نہ مانے تو۔

اصغر : اسے دھکے دے کر باہر نکال دیجئے (گوپال سے) اب تیسرے مریض کی باری ہے۔

تیسرے مریض بلونت نے اپنی تکلیف بتاتے ہوئے کہا، میرا حافظہ بہت کمزور ہے میں جو آج پڑھتا ہوں کل بھول جاتا ہوں۔

اصغر : جب آپ کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں، آپ کا دھیان کدھر ہوتا ہے؟

بلونت : کھیل کے میدان میں۔

اصغر : آپ کیا سوچ رہے ہوتے ہیں؟

بلونت : آج بڑا سہانا دن ہے۔ آج کرکٹ کا کھیل کھیلنا چاہئے۔

اصغر : تو آپ ایک وقت میں دو کام کرتے ہیں۔ پڑھتے بھی ہیں اور سوچتے بھی ہیں۔

بلونت : آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

اصغر : پڑھتے وقت صرف ایک کام کیا کیجئے۔

"کرنل صاحب، آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پودوں کو روزانہ پانی دیا کروں!"

بلونت : اگر خیال کسی اور طرف چلا جائے تو کیا کروں۔

اصغر : اسے ادھر ادھر بھٹکنے سے روکئے۔

بلونت : اگر وہ نہ مانے تو؟

اصغر : دوبارہ، سہ بارہ منع کیجئے۔

بلونت : وہ پھر بھی باز نہ آئے تو؟

اصغر : چند لمحوں کے لئے کتاب بند کر دیجئے اور اس خیال کو سمجھائیے وہ بے وقت آیا ہے، اس نے اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی، وہ پھر کبھی حاضر ہو سکتا ہے۔

بلونت : کیا اس طرح کرنے سے میرا حافظہ تیز ہو جائے گا۔

اصغر : جی ہاں۔

بلونت : مجھے یقین نہیں آتا۔

اصغر : کیوں؟

بلونت : میرا حافظہ قدرتی طور پر کمزور ہے۔

اصغر : کسی شخص کا بشرطیکہ وہ پاگل یا نیم پاگل نہ ہو حافظہ قدرتی طور پر کمزور نہیں ہوتا۔

بلونت : میں پاگل ہوں نہ نیم پاگل پھر میرا حافظہ کیوں کمزور ہے۔

اصغر : یہ محض آپ کا وہم ہے۔

گوپال : اور وہم کی دوا نہ ڈاکٹر اصغر کے پاس ہے، نہ

لقمان حکیم کے پاس تھی۔

اصغر : (بلونت سے) آپ جا سکتے ہیں۔ (گوپال سے) ـــــ چوتھا مریض کہاں ہے؟

چوتھے مریض مدن نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ میں ہر وقت اداس رہتا ہوں۔

اصغر : وجہ؟

مدن : بظاہر کوئی وجہ نہیں۔

اصغر : آپ دن میں کتنی بار ہنستے ہیں؟

مدن : میرا کبھی ہنسنے کو جی نہیں چاہتا۔

اصغر : کیا رونے کو جی چاہتا ہے؟

مدن : نہیں، صرف اداس رہنے کو جی چاہتا ہے

اصغر : آپ دن میں چار پانچ بار کھل کر ہنسا کیجئے۔

مدن : کس چیز پہ ہنسا کروں؟

اصغر : ہزاروں چیزیں ہیں۔

مدن : مجھے تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔

اصغر : اپنی رونی صورت بھی نہیں؟

مدن : اپنی رونی صورت میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔

اصغر : آئینے میں۔

مدن : لیکن اس پر کس لئے ہنسوں

اصغر : کیونکہ ایسی صورت پر عموماً لوگ ہنسا کرتے ہیں۔

مدن : فرض کیجئے، مجھے پھر بھی ہنسی نہ آئے۔

اصغر : کوئی لطیفوں کی کتاب پڑھئے۔

مدن : میں جب بھی لطیفے پڑھتا ہوں اور بھی سنجیدہ ہو جاتا ہوں

اصغر : اگر یہ بات ہے تو کسی دوست سے کہئے، آپ کو گدگدی کرے۔

مدن : کیا ہنسنے سے اداسی دور ہو جائے گی؟

اصغر : جی ہاں، اگر آپ قہقہہ لگا کر ہنسیں گے تو قہقہے کی آواز سے ڈر کر اداسی اس طرح بھاگ جائے گی جیسے پٹاخے کی آواز سے جانور بھاگتے ہیں۔

(گوپال سے) اب آخری مریض کو حاضر کیا جائے۔

آخری مریض اکبر کو ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "مجھے چیزوں کو توڑ پھوڑ کر یا دیواروں اور سائن بورڈ پر فضول باتیں لکھ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

اصغر : آپ اس مرض میں کب سے مبتلا ہیں؟

اکبر : کافی عرصہ ہو گیا۔

اصغر : آپ نے اب تک کتنی چیزیں توڑی ہیں۔

اکبر : بے شمار گملے، کرسیوں کی ٹانگیں۔ میزیں۔ برتن گل دان وغیرہ وغیرہ۔

اصغر : آپ دیواروں اور سائن بورڈوں پر کیا لکھتے ہیں؟

اکبر : عجیب سی باتیں۔ مثلاً جہاں لکھا ہوتا ہے 'اندر آنا منع ہے' میں اس میں یہ ترمیم کرتا ہوں 'اندر آنا منع نہیں ہے'۔ جہاں لکھا ہوتا ہے 'پھول مت توڑیئے'۔ وہاں لکھتا ہوں 'پھول ضرور توڑیئے'۔ اگر کوٹھی کا نام 'گوہر منزل' ہے تو میں گوہر کو 'گوبر' میں تبدیل کر دیتا ہوں۔

اصغر : آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟
اکبر : مجھے ایسا کرنے میں مزہ آتا ہے
اصغر : کیوں مزہ آتا ہے؟
اکبر : میں نہیں جانتا۔
اصغر : ہم جانتے ہیں
اکبر : تو پھر بتایئے۔
اصغر : اصل میں آپ اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھتے ہیں۔ اس احساس کو مٹانے کے لئے آپ عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں۔
اکبر : یہ بالکل غلط ہے، میں اپنے کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتا۔
اصغر : اگر کمتر نہ سمجھتے ایسی حرکتیں نہ کیا کرتے۔
اکبر : آپ سچ کہہ رہے ہیں۔
اصغر : جی ہاں۔ آپ ایسی حرکتیں کرکے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ بھی کوئی چیز ہیں۔
اکبر : یعنی میں اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے ایسا کرتا ہوں،
اصغر : جی ہاں
اکبر : اس احساس سے کیسے چھٹکارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔
اصغر : اچھے اور تعمیری کام کرتے ہے۔ کسی کھیل میں اوّل آنے کی کوشش کیجئے۔ کسی مضمون میں اتنی لیاقت پیدا کیجئے کہ سب آپ کا لوہا مان جائیں۔
(گوپال سے) اچھا۔ اب چار بج گئے ہیں، باقی مریضوں کو کل آنے کے لئے کہہ دو۔
گوپال : جی۔ باقی کوئی مریض نہیں ہے۔
اصغر : اگر باقی کوئی مریض نہیں ہے تو یہ اسپتال آج سے بند کیا جاتا ہے۔

■ ■

ہند ہمارا زندہ باد

محمد شفیع الدین نیّر

ہند ہے یہ فردوس نشان — جگ میں اس کی اونچی شان
تن ہو، من ہو، یا ہو جان — اس کی خدمت میں قربان
اس جذبے سے سب ہوں شاد
ہند ہمارا زندہ باد
ہند ہمارا زندہ باد

چین ہے اس میں راحت ہے — دل میں اس کی چاہت ہے
ہند ہی دھن ہے دولت ہے — ہند سے اپنی عزت ہے
یارب! اس کو رکھ آزاد
ہند ہمارا زندہ باد
ہند ہمارا زندہ باد

پھول یہاں کے پیارے ہیں — اپنی چھب میں نیارے ہیں
موتی ہیں یا تارے ہیں — چاند کے ٹکڑے سارے ہیں
فطرت کا ہے اس پر صواد
ہند ہمارا زندہ باد
ہند ہمارا زندہ باد

دریاؤں کا کیا کہنا — ہیں یہ بھارت کا گہنا
پھر ان میں جمنا گنگا — آہاہا! ان کا بہنا
سب زرخیزی کی بنیاد
ہند ہمارا زندہ باد
ہند ہمارا زندہ باد

اچھے ہوں اس کے دستور — کھوٹ کپٹ سے کوسوں دُور
سب کے دل ہوں پریم سے چُور — بھلمنساہت سے بھرپور
دُنیا دے اس دیس کو داد
ہند ہمارا زندہ باد
ہند ہمارا زندہ باد

بار نہ پائے جور یہاں　　عدل کے ہوں سب طور یہاں
اُلفت کا ہو دور یہاں　　ایکا ہو فی الفور یہاں
ختم ہوں بس آپس کے فساد

ہند ہمارا زندہ باد

ہند ہمارا زندہ باد

اِس کا رتبہ اعلیٰ ہو　　بول بھی اِس کا بالا ہو
ایسا طور نرالا ہو　　جگ اِس کا متوالا ہو
نیّر ہے یہ دِل کی مُراد

ہند ہمارا زندہ باد

ہند ہمارا زندہ باد

میڈرڈ (اسپین) کے جوکین لاپیڈرا
(پیدائش : ۱۸۶۷ ، وفات : ۱۹۴۸)
کا موتھہ اتنا بڑا تھا
کہ اس میں تین بڑی ناشپاتیاں
سما سکتی تھیں !

لوٹروسا (اسپین) کے جیزس اوگارٹے نے
یہ وعدہ کیا کہ اس کے دوست کی شادی میں اگر کوئی
مہمان بُلانے کے باوجود نہیں
آئے گا تو وہ اس کا کھانا خود کھالے گا۔ اس وعدے
کو نبھانے کے لئے اُسے نو آدمیوں کا کھانا
کھانا پڑا ـــــ جس میں سوپ، سبزیاں، گوشت سب
ہی شامل تھے
اس نے ۲۰ رول کھائے، ۳۶ پیالیاں چاکلیٹ کی پی
ڈالیں اور سات لٹر کافی حلق سے نیچے انڈیل لی۔
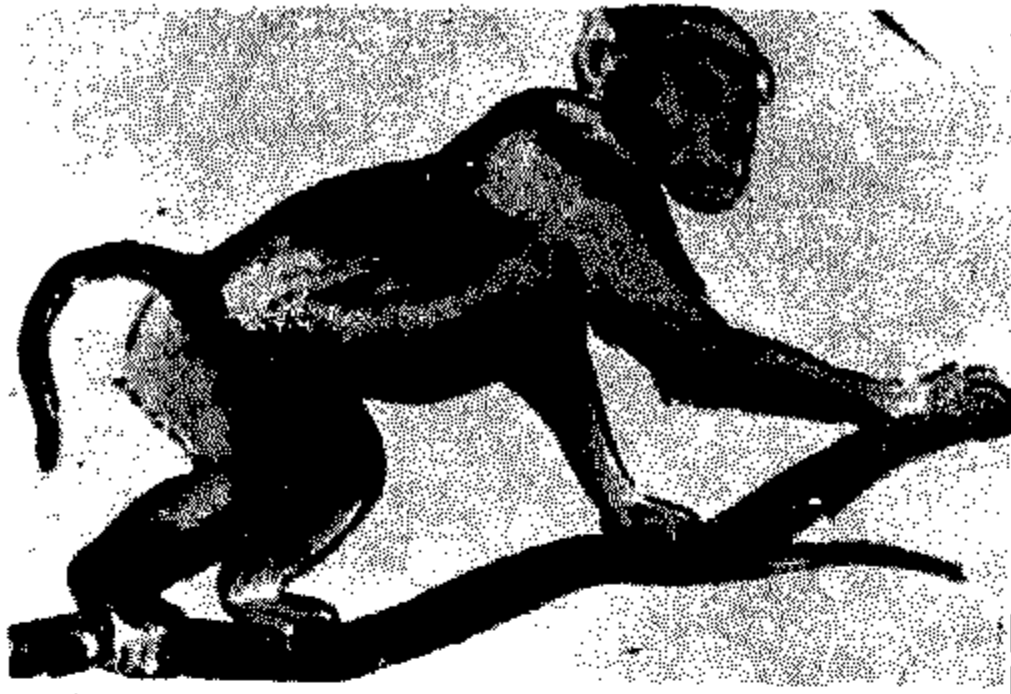
سارے جانوروں میں صرف ریسس بندر
ایسی مخلوق ہے جس کا
خون انسانی خون سے بالکل
ملتا جلتا ہے

ایک لاش نے خود ہی اپنے وطن تک سفر کیا !
انگلستان سے چلنے والے ایک جہاز میں پادری ریورینڈ بیک بھی تھے ۔ جہاز پر اُن کو
بیماری نے آگھیرا تو انہوں نے وصیّت کی کہ
مَرنے پر اُن کی لاش کو سینٹ ہیلنا کے جزیرے میں واپس بھیج دیا جائے ۔
لیکن جہاز کے عملے نے اُن کی لاش تابوت میں بند کر کے تابوت کو سمندر کے حوالے کردیا ۔
مگر تابوت تیرتا ہوا خود ہی ۲۰۰ ا میل کا فاصلہ طے کر کے سینٹ ہیلنا پہنچ گیا ، اور یُوں
پادری کی سینٹ ہیلنا میں دفن ہونے کی خواہش پوری ہو گئی

رَوُن کیٹو (اسپین) کے زداں پٹیا گورڈو نے ایک شرط جیتنے کے لیۓ
ایک تونبی لٹکائی جس میں سوا دو لیٹر سانی بھری ہوئی تھی —— اور اسے
وہ اپنے گدھے سے بھی زیادہ تیزی سے کھا گیا !

گھر بھر کی پسند
آپ کے لئے شمع، شبستاں
آپ کی بیوی اور بیٹی کے لئے بانو
بالغ بچوں کے لئے مجرم
چھوٹے بچوں کے لئے کھلونا
اور
ہندی جاننے والوں کے لئے سشما اور دوشی
ادارہ شمع کے یہ سات رسالے
قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور
جاذب نظر ہیں
آپ کو اگر اچھے مطالعہ کا شوق ہے تو
انہیں ضرور پڑھئے۔
یہ شمارہ طباعت، کتابت اور
مضامین کا اعلیٰ معیار
پیش کرتے ہیں۔
شمع
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے
سالانہ: ۱۲ روپے ۵۰ پیسے
سشما
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے
سالانہ: ۱۳ روپے ۵۰ پیسے
بانو
قیمت: ایک روپیہ
سالانہ: ۱۰ روپے ۹۵ پیسے
شبستاں
قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سالانہ: ۲۰ روپے
کھلونا
قیمت: ۷۵ پیسے
سالانہ: ۸ روپے ۹۵ پیسے
دوشی
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے
سالانہ: ۱۵ روپے ۹۵ پیسے
مجرم
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے
سالانہ: ۱۵ روپے ۹۵ پیسے
ادارہ شمع
آصف علی روڈ، نئی دہلی
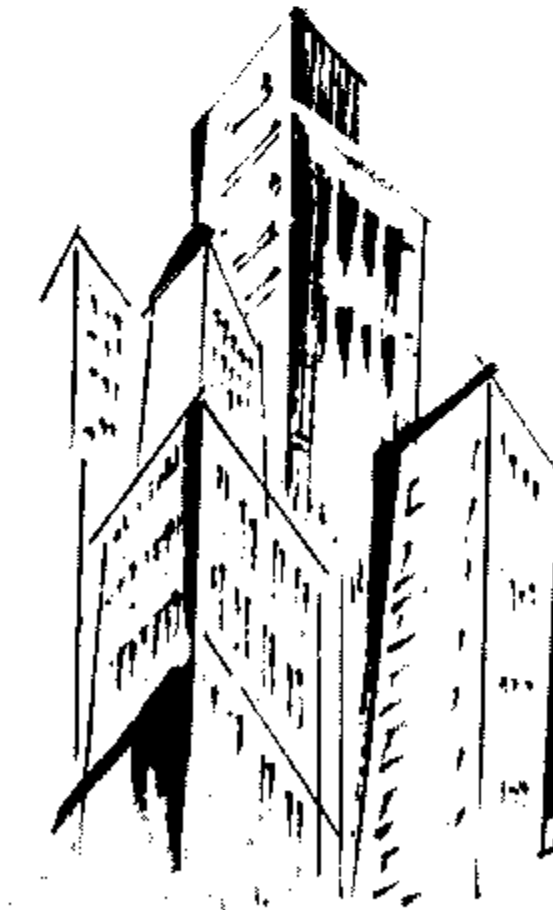
اگلی نسل کا نور

کوثر چاندپوری

فروری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے سفید کبوتروں کے بھٹکے ہوئے پروں کی طرح اُڑتے پھر رہے تھے اور کسان دعا مانگ رہے تھے کہ اب بارش نہ ہو۔ لگاتار تین دن سے مینہ برس رہا تھا۔ کبھی موسلا دھار برستا، کبھی باریک باریک پھوار پڑتی۔ ہر دم کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اولے نہ پڑ جائیں۔ زبیر روز رین کوٹ لے کر اسکول جا رہا تھا

اس روز گیارہ بجتے ہی لوٹ آیا۔ گھر سے ذرا فاصلے پر اُسے شکور مل گیا۔ یہ اُس کا پرانا دوست تھا۔ اکثر باہر والے میدان میں دونوں فٹ بال اور ہاکی کھیلتے وقت ساتھ ہو جایا کرتے تھے۔ شکور دور ہی سے زبیر کو دیکھ کر بولا "چھٹی ہو گئی؟ آدھے دن کا اسکول تھا آج؟"

"اسکول تو پورے دن ہی کا تھا۔" زبیر نے جواب دیا مگر آٹھویں درجے کا ایک لڑکا موٹر سے ٹکرا

گیا۔ اُسے جیب میں ڈال کر بہت سے لڑکے ہسپتال لے گئے۔ کچھ ٹیچر بھی ساتھ گئے ہیں۔ بس اسی وجہ سے چھٹی کی گھنٹی بجا دی گئی۔"

"اور اپنی اٹیچی وہیں چھوڑ آئے؟ خالی ہاتھ چلے آ رہے ہو۔"

"چھوٹے بھائی کو دے دی۔ وہ گھر لے گیا۔"

"بہت اچھا ہوا۔ بڑا عمدہ موقع ہے چلو سیر کر آئیں جنگل کی۔"

"کہاں چلو گے؟"

"جدھر کو منہ اُٹھ جائے گا اُدھر ہی کو چل کھڑے ہوں گے۔"

"منزل کا کوئی تصور ضرور ہونا چاہئے۔ آوارہ گردی کا میں قائل نہیں۔"

"منزل کے متعلق فیصلہ شہر سے نکل کر کیا جائے گا۔"

"خیر چلو۔" زبیر نے کہا۔

سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے دونوں اسٹیشن پہنچ گئے۔ پھر ریلوے لائن پار کر کے چنوں کے بہت بڑے کھیت کے کنارے جا کھڑے ہوئے۔ کھیت کافی بڑا تھا۔ پودے پیلے ہو چکے تھے۔ زبیر بولا "بتاؤ تنکو رکس طرف کو چلنا ہے۔"

"سوچتا ہوں، گڑھی چلیں وہاں گنے بہت ہوتے ہیں۔ نہر کے آس پاس گنے ابھی تک کھڑے ہوں گے۔ شوگر مل میں کئی دن سے ہڑتال ہے۔ ابھی گنے کاٹے نہیں گئے ہوں گے۔"

"کتنی دور چلنا پڑے گا؟ گڑھی تو بہت دور ہے۔"

کس نے کہہ دیا، دور ہے؟ پانچ میل سے زیادہ ہرگز نہیں۔ سات فرلانگ چلنے کے بعد پکی سڑک مل جائے گی۔ وہاں سے تانگا یا رکشا پکڑ لیں گے۔"

جلد ہی انہوں نے کچا راستہ طے کر لیا۔ پھر پچیس پچیس پیسے دے کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ گھوڑا بڑا مریل تھا۔ پھر بھی وہ پون گھنٹے میں گڑھی پہنچ گئے۔ اور آبادی سے چار فرلانگ اِدھر ہی نہر کے قریب اُتر گئے۔

نہر کناروں سے مل بہہ رہی تھی۔ جگہ جگہ بلبلے بن کر پھوٹ رہے تھے۔ گنگا کا شفاف پانی نہر کے کناروں میں بھینچ کر لجاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ دوسری جانب گنے کا فارم تھا۔ اس میں اونچے اونچے، رسیلے ہریلے گنے ٹھنڈی ہوا کی ہلکی جنبشوں سے بڑے مستانہ انداز سے جھوم رہے تھے۔ اُن کے سر اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے جیسے وہ اپنے اندر بھرے ہوئے میٹھے رس پر اترا رہے

۴ ۳ ۲

جادوگر کا کمال! فٹ بال غائب

تھے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے، کیوں کہ رس، گڑ، شکر، قند اور دُنیا بھر کی رنگ برنگی مٹھائیوں کا جنم داتا وہی تو ہے۔

زبیر کو ایک نظم کے چند مصرعے یاد آئے۔ وہ گنگنانے لگا۔

ساقیٔ شیریں نفس، اب کے برس
ہے نہیں گنّے میں رس، اب کے برس

شکور بگڑ کر بولا "کیا کہہ رہے ہو؟ ۔ بہت برس چکا تمہارا ساقی اور گنّوں میں رس تو اتنا ہے کہ مہینہ بھر تک اس نہر میں بہہ سکتا ہے۔ یہ اوٹ پٹانگ شعر تم اُس وقت پڑھنا جب نہ برسے اور خشک سالی ہو یعنی سوکھا کال پڑ جاتے۔"

"معاف کرو شکور بات سچائی کے خلاف تھی مگر داداجان کی نظم ذہن میں کروٹیں بدلنے لگی تھی۔"

اسے دو چار سال اور سونے دو، اِس وقت تو سارا ماحول اونگھ رہا ہے۔ آس پاس کوئی نہیں بالکل سناٹا ہے۔ آؤ کھیت سے دس پانچ گنّے توڑ لائیں اور پُل پر بیٹھ کر کھائیں۔

گنّے شہر میں بھی مِل جاتے ہیں۔ اتنی دُور آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"شہر کے سوکھے گنّوں میں رس بہت کم ہوتا ہے"

زبیر کا دل نہیں چاہتا تھا کہ بغیر اجازت کھیت میں سے گنّے توڑے مگر وہ شکور کی ضد کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اور وہ گنّے توڑ لایا۔ شکور کے پاس چاقو تھا۔ اُس نے دو تین نہیں بارہ تیرہ گنّے جڑ کے پاس سے کاٹ لئے۔ پتّے وہیں توڑ کر پھینک دئے اور پُل پر آگیا۔ اطمینان سے دونوں موہنہ سے گنّے چھیل کر کھانے لگے چھلکے نہر میں پھینکتے جارہے تھے۔

شکور رس کا گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ یہ مٹھاس شہر کے سوکھے گنّوں میں کہاں؟ باسی اور تازہ چیز کا ذائقہ بالکل الگ الگ ہوتا ہے۔

ابھی وہ اور کچھ کہتا مگر ایکھ کا مالک آگیا۔ گھاس کھودنے کا ایک بڑا سا کھرپا اس کے ہاتھ میں تھا۔ ڈانٹ کر بولا۔ "گنّے کیوں توڑے تم نے؟ میں تو نہر کے کنارے بیٹھا گھاس کھود رہا تھا۔ پانی میں اتنے بہت سے چھلکے بہتے دیکھ کر شبہہ ہُوا، بتاؤ جلدی گنّے کیوں توڑے؟"

"توڑے نہیں چودھری کے گھر سے لائے ہیں۔"

"وہیں کیوں نہ کھائے؟ یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم جھوٹے ہو۔ تم نے میرے ایکھ کو اُجاڑا ہے۔ آؤ میرے ساتھ پتّے وہیں پڑے ہوں گے۔"

دونوں کسان کے پیچھے پیچھے گئے۔ کسان نے پہلے پتّے اکٹھے کئے۔ پھر تازہ کٹی ہوئی جڑیں دکھا کر بولا،

شکر ہے بچ گیا

لیکن ——

"تم چور ہو!"

زبیر چپ رہا۔ شکور نے خوشامد شروع کر دی۔

"چودھری معاف کرو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔"

"ڈرو مت۔ میں ہاتھ نہیں اٹھایا کرتا بچوں پر۔ تمہیں پنچوں کے سامنے لے چلوں گا۔ معافی ان ہی سے مانگ لینا"

گڑھی کی پنچایت میں سات گاؤں شامل تھے چھوٹے چھوٹے جھگڑے پنچایت کے ممبر ہی چکایا کرتے تھے۔ ساہو رنجیت سنگھ سرپنچ تھے۔ وہ بہت بوڑھے، سمجھدار اور دیالو تھے۔ اسی کے ساتھ منصف مزاج بھی تھے دونوں ملزم اُن کے سامنے پیش کئے گئے۔ اُنہوں نے نیچے سے اُوپر تک لڑکوں پر نگاہ کی۔ دل میں رحم کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ لیکن انہیں انصاف کرنا تھا۔ پوچھا "بتاؤ لڑکو! مالک سے پوچھے بغیر گنّے کیوں توڑے ہے؟"

"پیاس لگی تھی" شکور جلدی سے بولا۔

"کہاں بیٹھے تھے تم؟"

"نہر کے پل پر"

"کیا نہر سوکھی پڑی تھی؟ اس میں پانی نہیں تھا؟"

"تھا مگر میں نے سوچا، نمکین ہوگا"

"گنگا کا پانی بوتلوں میں بھر بھر کر لوگ دُور دُور تک لے جاتے ہیں کسی نے اسے نمکین نہیں بتایا۔ وہ تو میٹھا ہوتا ہے"

"میں اس بات سے واقف نہیں تھا"

پنچایت کے چار ممبر اور آ گئے۔ اور اب باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ مرلی کسان کا بیان ہوا۔ اس نے سارا واقعہ سنایا اور دیر تک اپنے نقصان کا رونا روتا رہا۔

"کتنا نقصان ہوا تمہارا؟" ایک ممبر نے سوال کیا۔

"چھ سات روپے سے کسی طرح کم نقصان نہیں ہوا"

"معاف نہیں کر سکتے؟"

"بالکل نہیں۔ اگر ان کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو کل کو شہر کے سارے لونڈے ٹڈی دل کی طرح کھیت پر ٹوٹ پڑیں گے"

"میرے بچو! ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم نے گنّے توڑے ہیں" ساہو صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں توڑے ہیں" مرلی کسان بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ زبیر نے کہا

"نہیں ساہو صاحب، مرلی اور زبیر دونوں جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے گنّے نہیں توڑے"

"ہاں تم نے توڑے نہیں، چاقو سے کاٹے ہیں اُس کی دھار پر اب بھی رس جما ہوا ہوگا۔ میں پنچوں سے

کہتا ہوں کہ شکور کا چاقو دیکھ لیا جائے ۔ وہی میرا گواہ ہے ۔

چاقو دیکھا گیا ۔ اس پر مٹھاس کی چپچپاہٹ موجود تھی ۔

"تم جھوٹے ہو، چاقو سچا ہے ۔ اب میں تمہیں ضرور سزا دوں گا ۔ جھوٹ بول کر تم نے اپنا کیس بگاڑ لیا " ساہو رنجیت سنگھ نے سخت آواز میں کہا ۔

"سزا ضرور ملنی چاہیے ورنہ آگے کو یہ کوئی بڑی واردات کر بیٹھیں گے " دو ممبر ایک ساتھ بول اٹھے ۔

ساہو رنجیت سنگھ دیر تک خاموش بیٹھے سوچتے رہے ۔ پھر گمبھیر آواز میں بولے ۔ ٹھیک ہے سزا تم لوگوں کو ضرور ملے گی، ورنہ خود تمہاری زندگی پر برا اثر پڑے گا ۔ زبیر کو ذرا ہلکی سزا دوں گا، کیوں کہ اُس نے جھوٹ نہیں بولا ۔

"جھوٹ اور سچ کی بحث نہیں ہے جناب " ایک ممبر نے دخل دیا "چوری دونوں نے کی ہے ۔ جرم ایک طرح کا ہے ۔ سزا بھی یکساں ہونی چاہئے ۔ زبیر ایسا ہی نیک تھا تو اُس نے شکور کا ساتھ کیوں دیا ؟ "

"بالکل ٹھیک ہے میں کوی رادھے کشن کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں " ہادی خاں نے تائید کی ۔

"میں تم لوگوں کے لیے تین سزائیں تجویز کر کے تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ جو سزا چاہو اپنے لیے چن لو: ایک تو یہ ہے کہ دس روپے فی کس جرمانہ ادا کرو، ورنہ ایک ہی بیٹھک میں بیس بیس گنّے مونہہ سے چھیل کر کھاؤ اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو پانچ پانچ بید لگائے جائیں گے "

زبیر نے فوراً کہا، "میں دس روپے جرمانہ دوں گا بس ذرا گھر تک جانے کی اجازت دے دی جائے اور ایک

نہ جانے ہاتھی کہاں غائب ہوگیا ہے ۔

سائیکل بھی عنایت کر دی جائے ۔ میں ابھی روپے لے کر آجاؤں گا ۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سائیکل پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہو ! "

"ایسا نہیں ہوگا میں یقین دلاتا ہوں "

"اپنی قوم کے ایک ہونہار نوجوان پر مجھے بھروسہ ہے میں اس کا ضامن ہوں اور اسے گھر جانے کی چھٹی دیتا ہوں اور پنچایت کی سائیکل بھی اس کے حوالے کرتا ہوں " ساہو صاحب نے کہا ۔

زبیر چلا گیا ۔ شکور نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور گنّے کھانے کی سزا قبول کر لی ۔ وہ جلدی جلدی مونہہ سے چھیل کر گنّے کھانے لگا ۔ بارہ گنّے کھانے کے

سگنل کسی بھی وقت گر سکتا ہے۔ اس لئے سر پر لوہے کی ٹوپی پہن لی ہے۔

بعد ہی اس کا مونھ بری طرح دُکھنے لگا۔ دانت ہلتے ہوئے محسوس ہوئے مسوڑھے چھِل گئے۔

"اور نہیں کھا سکوں گا۔"

"نہ کھاؤ۔ بید لگائے جائیں گے۔"

چپراسی کو بید لگانے کا حکم دیا گیا۔ اس نے پتلا سا لچکدار بید گھماکر شکور کی کمر پر مارا تو وہ بلبلا گیا۔

"میں مر جاؤں گا۔"

"پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ جرمانہ دوگے؟"

"نہیں۔"

چپراسی نے دوبارہ بید کو ہوا میں لہرا کر شکور کی کمر پر دے مارا۔

وہ چیخا "میرا بید مت مارو۔ میں جرمانہ دینے کو تیار ہوں۔"

"زبیر لوٹ کر نہیں آیا ابھی تک؟" ہادی صاحب بولے

"وہ نہیں آئے گا۔" رادھے کشن نے جواب دیا۔

"جلدی مت کرو۔ ذرا دھیرج رکھو۔ زبیر ضرور آئے گا۔ دھوکا نہیں دے سکتا اس کی پیشانی پر اگلی نسل کا نور ہے۔"

اسی وقت گھنٹی کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی سچائی اور خوش حالی کا سورج نکل آیا ہو۔

"میں حاضر ہوں۔"

"جیتے رہو" ساہوجی نے جواب دیا۔

زبیر نے روپے پنچوں کے آگے ڈال دیئے۔ اور گھوم کر شکور کو دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"تمھارا ساتھی بارہ گنے کھاکر تھک گیا۔ اور دو بیدوں سے زیادہ کی چوٹ نہیں سہہ سکا۔ اسے بھی جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"اب یہ سائیکل مجھے دی جائے۔ میں روپیہ لینے شہر جاؤں گا۔"

"ممبروں میں سے کوئی شخص اس کی ضمانت دینے کو تیار ہے۔ سرپنچ نے پوچھا۔

سارے ممبر چپ رہے۔ سرپنچ نے کہا، "تمہیں جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ سائیکل بھی نہیں دی جائیگی جرمانہ ادا کرنے تک تم یہیں رہوگے۔"

شکور زور زور سے رونے لگا۔ زبیر نے کہا گھبراؤ نہیں۔ میں اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ تمہارے لئے بھی روپے لے آیا ہوں۔ تم بڑے بے وقوف ہو۔ روپے بچانے کے لالچ میں تمہیں ایک کی جگہ تینوں سزائیں بھگتنی پڑیں۔ سچ ہے کہ ہر بے وقوف آخر میں وہی کرتا ہے جو عقل مند پہلے کر چکتا ہے۔ آؤ چلیں۔"

●●

رئیس امروہوی

بنائی ہے بھیا نے کاغذ کی ناؤ
کاغذ کی ناؤ

چلو پہلے چھوٹی سی نالی بنائیں
پھر اس چھوٹی نالی میں پانی بہائیں
پھر اس بہتے پانی میں نیا چلائیں
تماشا یہ امی کو لاکر دکھاؤ
کاغذ کی ناؤ
بنائی ہے بھیا نے کاغذ کی ناؤ

یہ ناؤ تماشے دکھاتی ہوئی
چلی ناچتی اور نچاتی ہوئی
سنبھلتی ہوئی لڑکھڑاتی ہوئی
وہ ٹھہراؤ اس کا وہ اس کا بہاؤ
کاغذ کی ناؤ
بنائی ہے بھیا نے کاغذ کی ناؤ

وہ چھوٹی سی نالی وہ پانی کی دھار
چلی ناؤ کاغذ کی مستانہ وار
الٰہی ، مری ناؤ کا بیڑا پار
کوئی دیکھے اس کا اُتار اور چڑھاؤ
کاغذ کی ناؤ
بنائی ہے بھیا نے کاغذ کی ناؤ

سمندر کے ہوں یا ہوا کے جہاز
مبارک ہوں تم کو میاں سرفراز
مجھے اپنی کاغذ کی ناؤ پہ ناز
یہ ناؤ کہ بچوں کو جس سے لگاؤ
کاغذ کی ناؤ
بنائی ہے بھیا نے کاغذ کی ناؤ

صالحہ عابد حسین

ہمارا اقبال

اقبال بڑے مشہور شاعر ہیں۔ ان کا نام لگ بھگ ساری دُنیا میں مشہور ہے۔ جب تک اُردو اور فارسی زبانیں دنیا میں موجود ہیں ان کا نام باقی رہے گا۔ اُن کا کلام لوگوں کو عمل کا پیام دیتا رہے گا اور اُن کے دل اور دماغ کو روشنی بخشتا رہے گا۔

ڈاکٹر محمد اقبال نے جہاں بڑی عمر کے علم و عقل والے

بہت سے ٹیلی فونوں کی گھنٹی ایک ساتھ بج اُٹھی

لوگوں کو بڑی اہم باتیں سکھائی اور سمجھائی ہیں وہاں بچوں کے
لئے بھی سادہ، رواں اور پُراثر انداز میں چھوٹی چھوٹی دلکش
نظمیں لکھی ہیں، جن میں وہ اُن سے خُدا کی بنائی ہوئی حسین حسین
چیزوں کا تعارف کراتے ہیں۔ اُن کے دل میں آدمیوں کی سیوا
اور خدا سے محبت اور عقیدت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ
بچوں کو اُن کے دیس کی عظمت بتاتے ہیں اور محبت، ایکتا
اور اتفاق کا سبق پڑھاتے ہیں۔ وہ اور بھی میٹھی میٹھی باتیں
سُناتے ہیں۔

اس وقت ہم آپ بچوں کو اُن کی کچھ چھوٹی چھوٹی
پُرلطف نظمیں سُنائیں گے اس طرح آپ کے دل میں اقبال
اور اُن کے کلام کی بڑائی اور دل کشی ابھی سے بیٹھ جائے گی
جب آپ اور بڑے ہوکر اُن کا عربی کلام پڑھیں گے تو آپ
کو اندازہ ہوگا کہ اقبال کتنا بڑا شاعر اور کتنا بڑا انسان تھا
"بچے کی دعا" ان کی ایک چھوٹی سی، بڑی ہی سُندر
نظم ہے جس میں بچہ خدا سے دُعا مانگتا ہے کہ اسے ایسی زندگی
ملے جو دوسروں کی خدمت میں کام آئے وہ وطن کے لئے
زینت اور عزت بنے اور ہر برائی اور ہر گناہ سے محفوظ
رہے۔ چند شعر سُنئے:

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر طرف میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

"ہمدردی" میں وہ بچوں کو بتاتے ہیں کہ ہر ایک کو
دوسرے کی مدد کرنا چاہیے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بلبل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چگنے میں دن گذارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کے بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا

اور پھر آخر میں یہ گُر کی بات بتاتے ہیں ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

جگنو ایک ننھا سا کیڑا ہے، مگر خدا نے اُسے عجیب و
غریب روشنی بخشی ہے۔ وہ رات کی تاریکی میں ننھے ننھے بجلی
کے قمقموں یا تاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتا ہے۔ کون
بچہ ہوگا جو جگنو کو چمکتے دیکھے اور اس کو پکڑنے کو بے تاب

نہ ہو جائے۔ مگر شاعر کا دل جگنو کو دیکھ کر اُسے پکڑنے کے لیے نہیں بے قرار ہوتا۔ اُسے اس ننھی سی چیز میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ ایسے سُندر اور دل کش انداز میں جگنو کا حُسن اُجاگر کرتا ہے کہ پڑھنے والا جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔ دیکھیے مثالیں اور تشبیہیں کتنی حسین اور کتنی بھرپور ہیں

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن[1] میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں[2] کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب[3] کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا[4] کا
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت[5] بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
پروانہ اِک پتنگا جگنو بھی اِک پتنگا
وہ روشنی کا جویا[6] یہ روشنی سراپا[7]

بچوں کو ننھے مُنّے پرندوں کو پنجروں میں پالنے اور اُن کی خوب صورتی اور جادو بھری آواز سے لُطف اُٹھانے کا شوق ہوتا ہے۔ لیکن اقبال بتاتے ہیں کہ آزادی کی لگن انسان حیوان، چرند پرند سب کے دل میں شدّت سے ہوتی ہے اور جب کسی کو گرفتار کر لیا جائے تو اس پر سخت تکلیف گزرتی ہے۔ اسی طرح ایک طرف وہ بچّوں کے دل میں آزادی کی محبت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، دوسری طرف بے زبان جانوروں پر رحم کھانے اور اُن کی آزادی کو بیڑیاں نہ پہنانے کا سبق دیتے ہیں۔ دیکھیے پرندے کی فریاد میں کس درد بھرے

---

۱ باغ ۲ پھولوں کا تختہ ۳ چاند ۴ چوغہ ۵ اندھیرا ۶ تلاش کرنے والا ۷ سر سے پیر تک

افسر نے فوراً سب کے ریسیور اُٹھا کر جواب دینا چاہا

انداز میں وہ یہی کیفیت بیان کرتے ہیں۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں ہیں وہ اپنے گھونسلوں کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
ٹوٹے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

لیکن ایک کا بھی جواب نہ دے سکا

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

اقبال کو یوں تو ساری دنیا سے، ساری انسانیت سے پیار تھا، مگر اپنے وطن ہندوستان سے اسے بڑی گہری محبت تھی اور اس کی بڑائی اور عظمت کا گہرا احساس تھا۔ ان کی کئی ایسی نظمیں ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے ملک کی خوبصورتی بڑائی اور اس کی دوسری خوبیوں کو جوش کے ساتھ سراہا ہے۔ بھلا تم میں سے کون بچہ ہوگا جس نے یہ نظم گائی، سنی اور پڑھی نہ ہو؟

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
غربت[1] میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اور یہ سچائی تو ہر دل کی آواز ہونی چاہیئے نا؟

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

"ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ایک اور بڑی سُندر نظم ہے۔ زبان اور بیان کی خوبی اور سچے جوش کے ساتھ اپنے وطن کی تعریف نے اس کو بڑا ہی پُر اثر اور دل کش بنا دیا ہے:

چشتی[2] نے جس زمیں پر پیغامِ حق سُنایا
نانک[3] نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

تو بچو، یہ ہیں تمہارے اقبال۔ یہ تو چند نظموں کے تھوڑے سے شعر تم نے سُنے۔ ان کی کتاب 'بانگِ درا' میں تمہیں اور بھی کتنی ہی بچوں کی دل کش پُر اثر نظمیں ملیں گی جن کو پڑھ کر تم جھوم جھوم اُٹھو گے اور تمہارے دل میں ایک نیا عزم، ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوگا۔ خدا کی محبت اور اس کے بندوں کی خدمت کا جذبہ دل کی گہرائیوں سے اُبھرے گا، اور یہی اقبال کی شاعری کا اصل مقصد تھا۔ ●●●

[1] پردیس
[2] حضرت معین الدین چشتی خواجہ اجمیری
[3] گرو نانک

ٹینڈے دادا کا کارنامہ

فکر تونسوی

JAGDISH PANKAJ
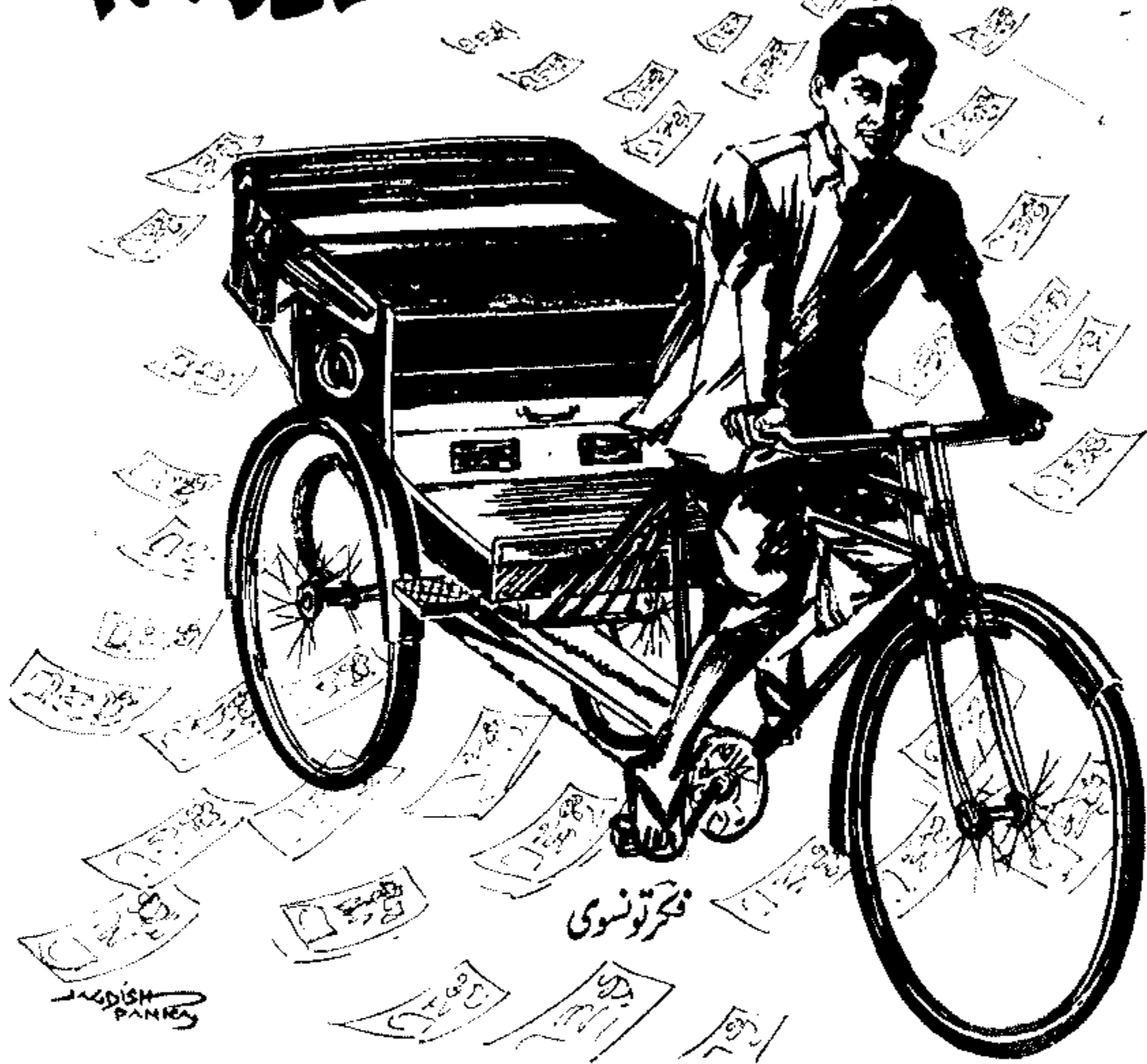
اَچانک ٹینڈے دَادَا نے دیکھا کہ وہ ایک بائیسکل رکشا چلا رہا ہے۔ سلیٹی رنگ کی ایک خوبصورت کار اس سے آگے نکلنے کی بار بار کوشش کرتی ہے مگر پیچھے رہ جاتی ہے۔ کار والے کو غصہ آیا۔ اس نے گرج کر کہا "لونڈے! اپنی رکشا روک لے شرم نہیں آتی کار کا مقابلہ کرتا ہے؟"

ٹینڈے نے ناک سے سیٹی بجائی اور ہنس کر کہا "اب یہ رکشا نہیں رک سکتی، کیوں کہ اس کی پانچ لاکھ روپے کی لاٹری نکل آئی ہے۔ قُر قُر قُرا!"

اس پر کار والے نے سائیکل رکشا کے ساتھ زور

کی ٹکر ماری ٹکر مارتے ہی کار رُک گئی اور سائیکل رکشا ہوا
میں اُڑنے لگی۔ ٹینڈے دادا نے نیچے کھڑے ہوئے کار
والے کو آواز دی۔ "آجاؤ سیٹھ گوبھی چند گوبھی چندجی!!
اُوپر آجاؤ" مگر کار والے نے صرف دانت پیسے اور ایک
پتھر اٹھا کر ٹینڈے دادا کی طرف پھینکا۔ پتھر واپس سیٹھ کی
ناک پر لگا۔ اور ناک الگ ہوکر ہوا میں اُڑنے لگی اور پھر وہ
ایک کالا کالا بھنورا بن کر ٹینڈے کے اِرد گرد گھومنے اور
ڈانس کرنے لگی۔ ٹینڈے گھبرا گیا۔ اس نے سائیکل رکشا کے بریک
زور سے دبائے۔ رکشا رُک گئی اور ہوا میں ہی ایک جگہ
لٹک گئی۔ ٹینڈے نے بھنورے سے پوچھا۔ "تم کون ہو
اور کیا چاہتے ہو؟"

بھنورا بولا۔ "میں تمہاری عزت ہوں، مجھے
پکڑ لو۔"

ٹینڈے نے ہاتھ بڑھا کر بھنورے کو پکڑ لیا۔ کیا
دیکھتا ہے کہ وہ بھنورا نہیں ہے بلکہ لاٹری کا ٹکٹ ہے اور
ٹکٹ میں سے آواز آئی "رکشا والے کی لاٹری نکل آئی!
رکشا والے کی لاٹری نکل آئی!"

اور پھر چاروں طرف سے سیکڑوں، ہزاروں لوگ
اُبھر آئے اور ٹینڈے دادا کے سر پر پھول برسانے لگے۔
اور نعرے لگانے لگے۔ "ٹینڈے دادا کی جے ہو! ٹینڈے
زندہ باد!"

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ٹینڈے کی سائیکل رکشا
نیچے سے کھینچ لی اور اُسے اُٹھا کر یوں پھینک دیا جیسے کوئی
مرے ہوئے چوہے کو پھینکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس
مرے ہوئے چوہے کی طرف دوڑے۔ ہر ایک کی یہ ہی
کوشش تھی کہ رکشا کو پکڑ کر اُسے چلانے لگے۔ ہر آدمی
کہہ رہا تھا "یہ رکشا خوش نصیب ہے۔ جو بھی اسے چلائے گا
اُس کی پانچ لاکھ کی لاٹری نکل آئے گی۔"

اچانک ایک دھماکہ سنا پڑا۔ اور رکشا ایک پہاڑ کی
چوٹی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور پھر یہ ٹکڑے ہوا میں
اُڑنے لگے اور لوگوں نے دیکھا یہ ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ کرنسی
نوٹ ہیں۔ پانچ کے نوٹ، دس کے، سو کے نوٹ۔ اور یہ
سب ہی نوٹ مارچ کرتے ہوئے ٹینڈے کی جھولی میں گرنے
لگے۔ جو آدمی بھی ان نوٹوں کی طرف لپکتا، نوٹ اُس کے
مونہہ پر طمانچے کی طرح لگتے اور وہ گال سہلانے لگتا۔ جب
بھی کسی کے طمانچہ لگتا ٹینڈے دادا قہقہہ لگا کر ہنس دیتا اور
کہتا "پکڑ لو، پکڑ لو ان نوٹوں کو پکڑ لو۔ میری طرف سے
کھلی چھٹی ہے۔"

تھوڑی دیر تک چھینا جھپٹی کا یہ ڈرامہ جاری رہا جس سے
لوگ تھک گئے اور پھر ٹینڈے نے دیکھا کہ سب ہی لوگ
مارے تھکن کے یوں نیچے دھرتی کی طرف گر رہے ہیں جیسے
پت جھڑ کے پتے گرتے ہیں۔ اب ٹینڈے ہوا میں اکیلا
کھڑا تھا اور ہزاروں کرنسی نوٹ اُس کے بدن سے چپک
گئے تھے۔ وہ چلایا۔ "اے خدا! اب میں کیا کروں؟
کہاں جاؤں؟"

اُس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ ایک سندر سی سلیٹی رنگ
کی کار تیزی سے آئی اور کسی ہاتھ نے ٹینڈے کو پکڑ کر کار
میں بٹھا لیا۔ اور کار سناں کرتی ہوئی نیچے دھرتی کی طرف
اُترنے لگی۔ ٹینڈے دادا نے ڈر کے مارے آنکھیں بند
کر لیں، اور پوچھا "تم کون ہو؟ یہ کار کس کی ہے؟"

جواب آیا "میں تمہاری ماں ہوں یہ کار تمہاری
ہے بیٹا!"

ٹینڈے نے آنکھیں کھول دیں اور بولا "ممی کیا تم
میری وہی ممی ہو، جس نے کل میری پٹائی کی تھی؟"
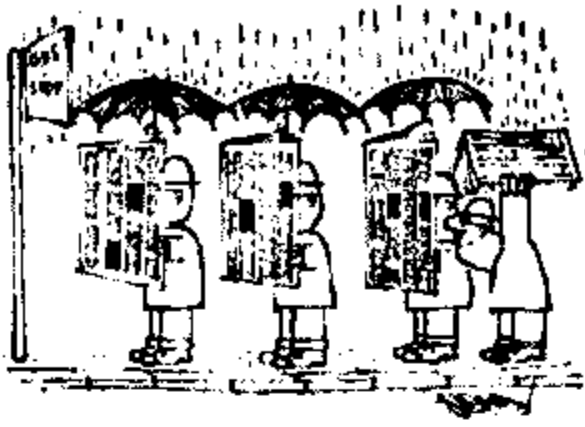
"ہاں! کل تم نے اپنی گولک توڑ کر ایک روپیہ نکال لیا تھا نا؟ اس لئے پٹائی کی تھی۔ مگر بیٹے اگر تم مجھے بتاتے کہ تم اس روپے سے لاٹری کا ٹکٹ خرید رہے ہو تو میں تمہاری بلائیں لیتی، تمہیں آشیرواد دیتی۔"

ٹینڈے نے اپنے بدن سے چپکا ہوا ایک روپے کا نوٹ اتارا اور کہا "یہ لو ماں! لو گولک والا ایک روپیہ اور جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"نہیں میرے لال!" ماں نے کار روک کر کہا۔ "میری ممتا تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہے؟ تمہارے پاس اتنی بڑی مایا ہے، اور سنسار بڑا ظالم ہے۔ تمہیں بھولا بھالا سمجھ کر لوٹ لے گا بیٹا! چلو، گھر چلو، سب ہی رشتے دار تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"نہیں ماں!" ٹینڈے چلایا "مجھے پہلے بھنجو حلوائی کے پاس جانے دو مجھے اس کے دو روپے اُدھار کے چکانے ہیں۔"

لیکن اتنے میں بہت سے رشتے دار گھر سے باہر نکل آئے۔ ٹینڈے کے مونہہ میں لڈو، برفی اور جلیبیاں ڈالتے گئے اُنھوں نے اُسے کار سے اُتار کر گھیر لیا۔

ایک نے پکارا "ٹینڈے میں تمہارا ماموں ہوں۔"

دوسرا بولا "میں تمہارا چچا ہوں۔"

"میں تمہاری خالہ ہوں۔"

"میں تمہاری بُوا ہوں۔"

"میں تمہارا بھنجو حلوائی ہوں۔"

اور پھر ایک ساتھ پشت سے ڈھول اور نقارے اور ریڈیو سیٹ بجنے لگے۔ اور مبارک بادوں اور دعاؤں سے سارا ماحول گونج اٹھا۔ ٹینڈے کا دل گھبرا گیا۔ وہ ایک دم تن کر بیچ میں کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا "ہٹ جاؤ سب ہی ایک ایک گز پیچھے ہٹ جاؤ۔"

اخبار تو دوسرے کا بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

سب لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

"اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھاؤ!" ٹینڈے نے حکم دیا۔

سب نے ہاتھ بڑھا دیئے اور ٹینڈے اپنے بدن سے کرنسی نوٹ اتار اتار کر ہر ایک کے ہاتھ پر رکھتا گیا۔ ننھے دادا کی یہ کھلی دین دیکھ کر گلی محلے کے سب بچے بھی اکٹھے ہو گئے اور سب نے اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں پھیلا دیں — ٹینڈے دادا نے سب کے ہاتھ کرنسی نوٹوں سے بھر دیئے اور جب سب لوگ نوٹوں کی بھیک لے چکے تو ٹینڈے نے پکارا "کوئی اور ہے دَھن کا لوبھی؟"

"میں ہوں۔ ایک کمزور سا آدمی اُدھر سے بھاگتا ہوا آیا "میں بائیسکل رکشا والا! ٹینڈے دادا، تم میری رکشا لے گئے تھے۔ وہ کہاں ہے؟ رکشا کے بغیر تو میں یتیم ہو گیا اُوں اُوں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ ٹینڈے دادا کو ترس آگیا۔ اُس نے باقی سارے نوٹ اُس رکشا والے کو دے دیئے رکشا والا بھاگا۔ سب لوگ اُس کے پیچھے بھاگے۔

اور پھر اچانک ایک دھماکا سا ہوا، جیسے بہت سے لوگ کسی کنوئیں میں جا گرے ہوں اور اس دھماکے سے ٹینڈے دادا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چارپائی سے نیچے گر پڑا تھا اور اُس کی ماں اُس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔ "ارے کیا ہوا میرے لال کو؟ دیکھوں کہیں چوٹ تو نہیں لگی!" ●●

یہ بہادر اور ذہین بچے

ڈان فرانسسکو انٹونی کو ۱۶ سال کی عمر میں ۱۷۷۰ میں کولمبیا کی بوگاٹا یونیورسٹی میں قدرتی تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔

جارج بلارڈ ایک درزی کے یہاں کام سیکھتا تو اس کے پاس کتابیں خریدنے کے لئے رقم نہیں تھی اس لئے اس نے انگریزی کی ڈکشنری نقل کر لی اور بائیس کتابوں کو زبانی یاد کر لیا۔

اسپین کے شاہ فرڈانند چہارم نے دس سال کی عمر میں دس ہزار محاورے زبانی یاد کر لئے تھے اور پوری لغت حفظ کر لی تھی۔

اٹھارویں صدی میں آٹھ سالہ بروس آڈم طوفان میں پھنسے ہوئے ایک قافلہ کے لئے کھانے کا سامان لے کر ڈیڑھ سو میل تک تنہا چلتا رہا تھا، اس دوران نہ وہ سویا اور نہ اس نے ایک لمحہ کے لئے آرام کیا۔

انعامی
مقابلہ

سردی کی رُت ہے۔ رات ہو چلی۔ قمقمے جل اُٹھے۔ آتش دان میں کوئلے دہکنے لگے۔ بچے جم کر بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھوں سے دیوار پر جانوروں کی دنیا آباد کرنے لگے ——— پرچھائیوں کا یہ کھیل تم نے بھی ضرور کھیلا ہوگا۔ ذرا اپنے آپ کو پرکھ کر تو دیکھو کہ تمہیں کتنی مہارت حاصل ہے۔ یہاں ہم نے ہاتھوں کے کچھ پوز دے رکھے ہیں اور ان کی پرچھائیوں سے دیوار پر جو تصویریں بنتی ہیں وہ غائب کردی ہیں۔ سب کی سب جانوروں کی تصویریں ہیں۔ خود مشق کرکے، یا ہمت ہو تو صرف تصور کے زور سے انہیں پہچانو اور ایک کاغذ پر ترتیب سے لکھ کر ہمیں بھیج دو۔ صحیح جواب بھیجنے والوں میں سے قرعہ اندازی کے ذریعہ بیس بھائیوں بہنوں کو ایک ایک روپے کی کہانیوں کی کتابیں بھیجی جائیں گی۔ جواب ہمارے پاس ۲۲ فروری تک پہنچنے ضروری ہیں۔
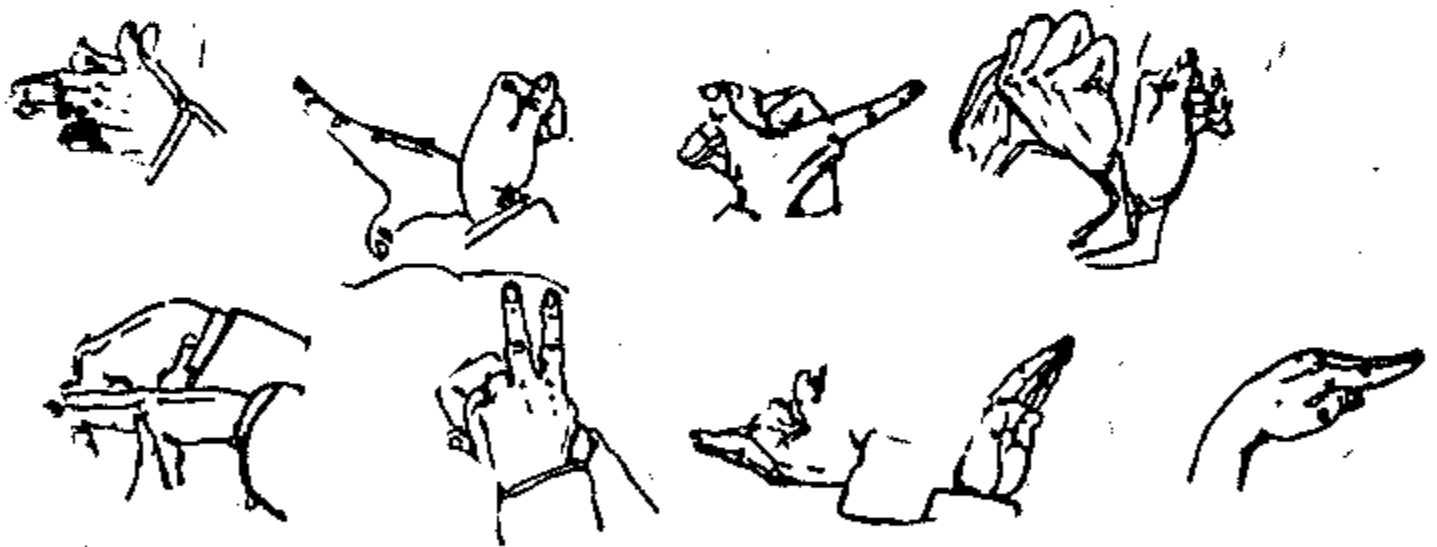
”پرچھائیوں کا کھیل“ ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۔ ۱

بلبل رانی کی گرفتاری اور رہائی

منّے نے اک بلبل پالی
جس کی رنگت تھی مٹیالی

یعنی کچھ کالی کچھ خاکی
تھی اُس میں پھُرتی، بے باکی

اِک لمبا مضبوط سا تاگا
اس کے دہنے پاؤں میں باندھا

تاکہ اگر وہ اُچکے، پھُدکے
پھر اُنگلی ہی پر آ بیٹھے

ہاتھ پہ بیٹھی پھُر پھُر کرتی
پیٹ بھرا تھا پھر کیوں مرتی

منّے دیتے دانہ پانی
نام رکھا تھا بلبل رانی

دُم کے تلے تھی اُس کے لالی
ایک چڑے کی تھی وہ سالی

کھانے پینے سے تھی موٹی
اس کے سر پر تھی ایک چوٹی

کنگھی چوٹی کرتی تھی وہ
پھولوں پر بس مرتی تھی وہ

پھولوں کی تھی وہ بیراگن
کب تھی بیوہ تھی وہ سہاگن

رہتی تھی وہ ہر دم چنگی
شرمیلی تھی کب تھی ننگی

رنگیں، صاف اور پاک پروں کی
پہنے تھی پوشاک پروں کی

چھوٹی سی تھی چونچ نکیلی
آنکھیں بھی تھیں خوب رسیلی

سُرمہ تھا قدرت نے لگایا
بولنا حصّے میں تھا آیا

حال وہ اپنا یُوں کہتی تھی
ایک چمن میں میں رہتی تھی

میرا وطن بس وہ ہی چمن تھا
من میرا ہاں خوب مگن تھا

سارے چمن میں پھول کھِلے تھے
مجھ کو یہ میکے سے مِلے تھے

ان پھولوں سے پیار تھا مجھ کو
جنت یہ گلزار تھا مجھ کو

پھرتی تھی میں ڈالی ڈالی
جلتا تھا بس مجھ سے مالی

بھاتی تھی ہریالی مجھ کو
تاکتا تھا اُف مالی مجھ کو

اِک دِن اُس نے جال بچھایا
مجھ کو وہ دھوکے میں لایا

دے کے مجھ نادان کو جھانسا
جال میں اُس نے مجھ کو پھانسا

چالاکی سے پکڑا مجھ کو　　　دو آنے میں بیچا مجھ کو
کھوئی گئی ساری آزادی　　　بس یوں ہوئی تھی بربادی
سادی سادی تھی یہ کہانی　　　قید کا ہے اب دانہ پانی
اب میں تمہارے پاس ہوں مُنّے
چھٹنے سے بے آس ہوں مُنّے

مُنّے نے یہ بات سُنی جب　　　دِل میں اُس نے یہ سوچا تب
اِس کو بس آزاد کروں میں　　　اِس کے دِل کو شاد کروں میں
مُنّا بُلبُل سے یہ بولا　　　میں نے تیرے پاؤں کو کھولا
مت بن پیاری تو فریادی　　　دیتا ہوں تجھ کو آزادی
شاد ہوئی آزادی پاکر　　　دیں یہ دُعائیں سر کو اُٹھا کر
مُنّے سدا آزاد رہو تم　　　شاد رہو آباد رہو تم
اپنے وطن کو جاتی ہوں میں
پیارے چمن کو جاتی ہوں میں

یکتا امروہوی
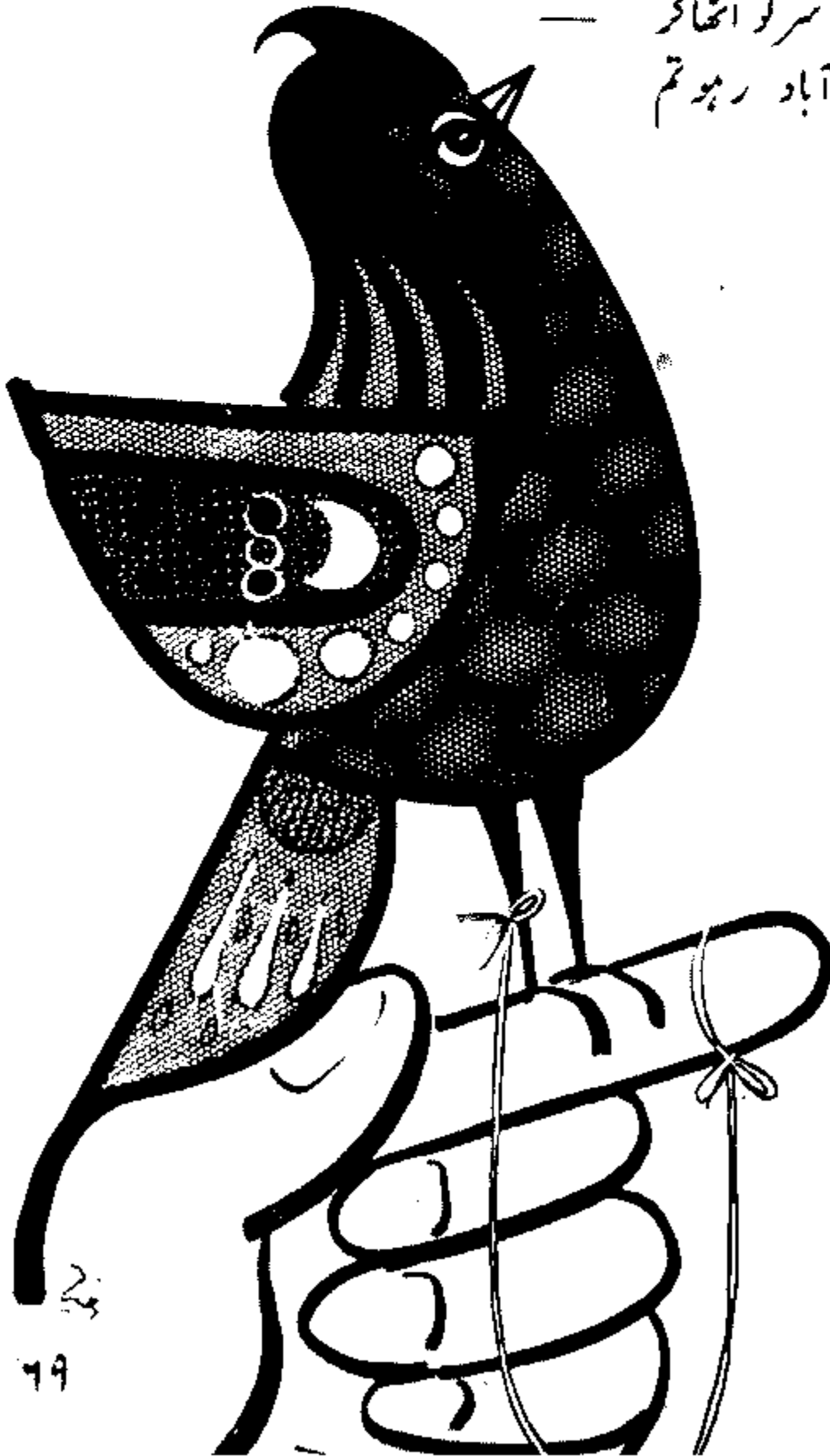
پہلے خوفناک جزیرہ

پھر کالی دُنیا

اور اب

سراج انور کا لکھا ہوا

ہیبت ناک، حیرت انگیز اور بھیانک ناول

جس میں "خوفناک جزیرہ" اور "کالی دُنیا" کے جانے پہچانے کردار فیروز اور اس کے ساتھی، زمین سے لاکھوں میل دُور اوپر خلاء میں جاتے ہیں اور وہاں خوفناک بلاؤں، عجیب انسانوں اور خون خوار درندوں سے مقابلہ کرنے کے بعد پلاسٹک کی ایک سینٹی میٹر دُنیا میں قید کردیے جاتے ہیں!

لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟

دِل کو لرزا دینے والا، راتوں کی نیند حرام کردینے والا اور آسمانی دُنیاؤں کی سَیر کرانے والا یہ سائنسی معلومات سے بھرپور ناول، بچّوں اور بڑوں دونوں کو بے حد پسند آئے گا۔

یاد رکھئے، ابھی اس کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات اور باقی ہیں

اگر آپ نے فوٹو آفسیٹ سے چھپے ہوئے اِس ضخیم ناول کو نہیں پڑھا تو پھر کچھ بھی نہیں پڑھا ـــــ بہت جلد کھلونا بک ڈپو کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے۔

سراج انور

ماموں اونٹ

خدا جانے کس ستم ظریف نے انہیں یہ نام دیا تھا۔ حالانکہ اُن کا اصل نام تو کچھ اور تھا، مگر سب لوگ انہیں "ماموں اونٹ" کہہ کر پکارتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ بے حد دُبلے پتلے انسان تھے اور اس کے

ڈاکو بینک لُوٹ کر بھاگ ہی رہا تھا کہ ان صاحبہ نے تربیداری کی ٹوکری اس کے راستے میں اُلٹ دی

ساتھ ہی بے تحاشا لمبے بھی ۔ بہت سے بچّوں کا تجربہ تھا کہ جب کبھی انہوں نے ماموں اونٹ کو اُن کے پیروں کے پاس کھڑے ہو کر دیکھا، اُن کے سروں پر سے ٹوپی گِر گئی ململ کا کرتہ پہن لینے کے بعد ان کے جسم کی ایک ایک ہڈی کا پتہ چل جاتا تھا ۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ قریب کے اسپتال میں انہیں زبردستی داخل ہونا پڑا ۔ وہ بیمار دیکار بالکل نہیں ہوئے ۔ بس ڈاکٹر لوگ اُن کے جسم کے جوڑوں اور ہڈیوں کا معائنہ کرنا چاہتے تھے ـــــ اس لئے اُن کو اسپتال میں بلایا گیا تھا، کیوں کہ اُن کے کانپ ٹھڈ ے اس قسم کے تھے کہ ڈاکٹری سیکھنے والوں کے لئے بڑے مددگار ثابت ہوتے تھے ۔

لمبے قد کے ساتھ ہی قدرت نے انہیں لمبی گردن بھی بڑی فراخ دِلی سے عطا کی تھی ۔ گردن کے آخری سرے پر ان کا ننھا مُنا سا سر جُڑا ہوا تھا، اور اس لمبوترے سر کے ساتھ جو منہہ لٹکا ہوا تھا، اس میں وہ ہمیشہ پان کی گلوری دبائے رکھتے تھے اور اس طرح لوگ انہیں جگالی کرتے ہوئے بھی بآسانی دیکھ سکتے تھے ۔ اونٹ کی بہت سی خاصیتیں اور خوبیاں بھی اُن میں پائی جاتی تھیں ۔ اونچے قد کے ساتھ ہی وہ لمبے لمبے قدم رکھ کر چلتے تھے اور اس طرح اُن کی لمبی گردن کی وجہ سے ان کے قدموں سے پہلے اُن کا چہرہ ہر جگہ پہنچ جاتا، جب وہ بیٹھتے تو اونٹ کی طرح اپنی ٹانگوں کو تہہ کر لیتے ۔ جگالی کرتے رہتے اور مونہہ ہی مونہہ میں کچھ بڑبڑاتے رہتے ۔ اُن کی ریڑھ کی ہڈی چونکہ اتنے لمبے جسم کا وزن آسانی سے نہیں سنبھال سکی تھی، اس لئے بے چاری کمر جھک گئی تھی اور یہ جھکاؤ دُور سے کوہان جیسا ہی نظر آتا ۔

اونٹ کی طرح ہی وہ بڑے سیدھے سادے ۔ مخلص اور محنتی تھے، کسی بھی کام کے لئے اُن سے کہا جائے تو وہ کبھی انکار نہیں کرتے تھے ۔ وہ کیا کام کرتے تھے ؟ یہ بات آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکی ۔ دیکھنے والے دیکھتے کہ کبھی پتنگوں کا مانجھا سوت رہے ہیں، کبھی گوٹہ کناری کا کام کر رہے ہیں اور کبھی کسی کے گھر کا سودا سُلف لا رہے ہیں ۔ جب برسات گزر جاتی تو وہ ایک مقامی ٹھیکے دار کے پاس عارضی طور پر ملازم بھی ہو جاتے ۔ یہ ٹھیکے دار دریائے جمنا کی ریت کا ٹھیکہ لیا کرتا تھا اور ریت کے

ایک بہت بڑے اور اونچے ٹیلے کی حفاظت اس نے ماموں اونٹ کے سپرد کر رکھی تھی۔ مجھے ان کی اس ملازمت کا شاید کبھی پتہ نہ چلتا اگر ایک دن میں پک نک کے لئے اوکھلا نہ جاتا۔

میں جب اپنے دوستوں کے ساتھ ریت کے اس ٹیلے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ریت پر کسی کے قدموں کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ ریت پر ایسے نشانات عام پائے جاتے ہیں اور یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں تھی۔ مگر میں اس بات پہ حیران ہوا کہ قدموں کے درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ اپنے اس شبہ کی تصدیق کی خاطر میں نے خود اپنے پیر نشانوں پر رکھنے کی کوشش کی مگر جناب ٹانگیں جواب دے گئیں۔ میں حیرانی سے ان نشانات کو دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے ایک ساتھی نے موقع پر ایک شعر موزوں کیا۔

گیا ہے اونٹ کوئی اس طرف سے
پتہ دیتی ہے دوری نقشِ پا کی

شعر کیا تھا گویا شیخ ادبی معمے کا صحیح حل گیا۔ اشارہ ملنا تھا کہ میرے دوستوں کی زبان سے ایک ساتھ 'ماموں اونٹ' کا نعرہ بلند ہوا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ ماموں اونٹ ریت پر سے ضرور گزرے ہیں، یہ خیال کتنا صحیح تھا، اس کا فوراً ہی اندازہ بھی ہو گیا۔ کیوں کہ میں نے دیکھا کہ اوپر سے دو اونٹ ایک دوسرے پر سوار میری ہی طرف آرہے ہیں۔

دراصل یہ ہم سب کے دوست ماموں اونٹ تھے جو سچ مچ کے ایک اونٹ پر سوار تھے۔ آگے پیچھے جھولتے ہوئے ہماری ہی طرف آرہے تھے۔ جب وہ میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے تو مجھے بھی انہیں اس طرح دیکھنا پڑا جس طرح لوگ دلی کی قطب مینار کو دیکھتے ہیں۔ میں نے اپنی گردن اوپر اٹھائی کہ چٹ چٹ کی آواز کے ساتھ گردن کی کئی ہڈیاں چیخ گئیں۔ ماموں اونٹ، اونٹ پر تشریف فرما تھے، اور ہمیں مسکرا کر

لمبی ٹانگیں

دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے اور میں گردن اٹھائے یہ سوچ رہا تھا کہ آخر اونٹ پر اونٹ کس طرح بیٹھ گیا۔

میرے دوستوں کا خیال تھا کہ ماموں اونٹ سطح سمندر سے آٹھ فٹ بلند تھے اور سچ مچ کے اونٹ پر بیٹھ جانے کے بعد یہ بلندی سترہ فٹ تک پہنچ جاتی تھی۔ سطح سمندر سے اتنا اونچا ہونے کی وجہ سے اُن کے گھٹنے ہوئے دماغ پر ہر وقت برف جمی رہتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ قاعدے کی باتیں اُن کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ کہو کھیت کی سنتے کھلیان کی —— ہمیشہ اپنی من مانی کرتے۔ اتنی بڑی دنیا میں وہ بالکل اکیلے تھے اور شاید یہ اکیلے پن اور تنہائی کا احساس ہی تھا جس کی وجہ سے وہ محلّے کے بچوں پر جان دیتے تھے۔

بچوں نے انہیں دوست کی طرح کبھی قبول نہیں کیا بلکہ اُلٹا وہ اُن کا مذاق اُڑاتے تھے۔ ماموں اونٹ دراصل ماموں اونٹ کی چڑ تھی اور آپ جانتے ہی ہیں کہ چڑ کتنی خطرناک چیز ہوتی ہے؟ اچھے خاصے اور معقول انسان کو چڑ کے ذریعے ایک منٹ میں چلت کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ڈھیٹ اور تیز مزاج دار شخص اگر کسی طرح تاؤ میں نہ آتا ہو تو چڑ اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش اور ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ ماموں اونٹ بھی دراصل پہلے پہل اس چڑ کا شکار ہوتے تھے۔

ایک بار وہ گلی میں سے گزرتے وقت گردن اونچی کئے ہوئے چل رہے تھے۔ نیچے دیکھ نہیں سکے اور ایک چھوٹے سے قد والی بڑی بی اُن کے راستے میں آ گئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ماموں کی ٹانگوں سے لپٹ کر گر گئیں۔ ماموں بِدک گئے اور بڑی بی نے انہیں بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ موا اونٹ کی سی گردن اٹھا کر چلتا ہے تو محلے کے سب لوگ ہنس پڑے۔ ویسے تو وہ جگت ماموں تھے اور محلے کا ہر شخص انہیں ماموں کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ لیکن اُس دن کے بعد سے سب نے انہیں ماموں اونٹ کہنا شروع کر دیا۔

اور یوں وہ بچارے 'ماموں اونٹ' بن کر رہ گئے۔

جب بھی وہ گلی سے گزرتے ماموں اونٹ، ماموں اونٹ کی آوازوں سے گلی گونج اُٹھتی۔ بچے ہاتھوں کی چونچ بنا کر انہیں دِکھاتے۔ اُس وقت اُن کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ وہ اپنی لکڑی دُور ہی سے اُن کی طرف گھماتے، انہیں مارنے کو دوڑتے۔ بُری طرح کوستے۔ چلا چلا کر کہتے کہ نالائقو! اس طرح ماروں گا کہ زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ نہ اُٹھ سکو گے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے مونہہ سے گالیوں کا فوارہ اُبل پڑتا۔ اِن گالیوں سے بچوں کو اگر نہیں تو اُن کے ماں باپ کو ضرور بُرا ماننا چاہیے تھا۔ اتفاق سے میرا اپنا بچہ راشد بھی انہیں چڑاتا تھا۔ لیکن گالیاں سُن کر میں نے کبھی ماموں اونٹ کی باتوں کا بُرا نہیں مانا۔ وہ میرے سامنے مجھے بُرا بھلا کہتے۔ محلے کے دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتا۔

ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ محلے کے شریر نوجوانوں نے ایک دن اُن کی خوب گت بنائی۔ بات بھی اچنبھے کی تھی، دس پندرہ منچلے اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے آپس میں یہ مشورہ کر لیا کہ ماموں اونٹ کو بے وقوف بنایا جائے۔ ماموں اونٹ بچارے ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سوتے تھے۔ کوئی انہیں سوتے میں کتنا ہی ہلاتے، کتنا ہی جھنجھوڑتے، کتنی ہی بار آوازیں دیتے مگر اُن کی پلکیں تک نہ جھپکتی تھیں۔ نوجوانوں نے اُن کی اسی عادت سے فائدہ اُٹھایا۔ ایک رات انہیں چپکے سے اٹھایا اور پھر ڈنڈا ڈولی کر کے شہر سے باہر ایک ایسے مکان کے قریب لے گئے جو بہت اونچا تھا۔ مکان کی چھت کچی تھی اور چار دیواری بھی۔ البتہ اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں نہیں تھیں۔ شریر لڑکوں نے سیڑھی لگا کر انہیں چھت پر لٹا دیا۔ اور پھر سیڑھی ہٹا کر سب واپس آ گئے۔ رات کو کسی وقت ماموں اونٹ اُٹھے ہوں گے اور خود کو ایک اونچے مکان کی چھت پر لیٹے پا کر اُن کی گھگی بندھ گئی۔ وہ بڑے پریشان ہوئے۔ چھت کافی اونچی تھی اِس لئے اوپر سے کودنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ ماموں اونٹ دہشت اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ صبح جب لوگوں نے انہیں اُتارا تو وہ بخار میں تپ رہے تھے، اور نہ جانے کیا اول فول بک رہے تھے۔

صحت یاب ہو جانے کے بعد جب بھی انہوں نے محلے والوں سے یہ معلوم کیا کہ آخر وہ چھت پر کس طرح پہنچ گئے تھے؟ انہیں یہی جواب ملا۔

"ماموں آپ اس مکان کے آس پاس ٹہل رہے ہوں گے اور پھر آپ کے جی میں نہ جانے کیا آئی ہو گی کہ آپ نے ایک لمبی چھلانگ لگائی ہو گی۔ ماموں اونٹ آپ پہلے ہی ہیں، لہٰذا آپ چھت پر چڑھ گئے ہوں گے۔"

اس جواب پر ماموں اونٹ نے لوگوں کو کتنا بُرا بھلا کہا ہو گا۔ یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ماموں اونٹ دِل کے بھی بہت اچھے تھے۔ اس کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ایک دن میرے ہی ساتھ پیش آیا تھا۔ پہلے کی طرح راشد نے دوسرے بچوں کے ساتھ

ہل کر انہیں چہ نچ دکھائی اور انہیں ماموں اونٹ کہہ کر چڑایا ماموں نے بچوں کی خوب خبر لی، انہیں خوب بُرا بھلا کہا۔ شاید ایک آدھ کے ہاتھ بھی رسید کر دیا۔ اُن کا موڈ غالباً اس دن بہت ہی خراب تھا، ورنہ اس قسم کی ہاتھا پائی وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں غالباً ان کا وہ پہلا موقع تھا جب کہ انہوں نے بچوں کی ٹھکائی کی تھی۔ بچے بہت گھبرائے اور ان سے ڈر کر دور بھاگ گئے۔ ماموں اونٹ اس طرح انہیں ماریں گے، یہ انہوں نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا۔

بچوں نے انہیں ماموں اونٹ کہہ کر چڑانا بند کر دیا گلی میں سے وہ چپ چاپ گزر جاتے اور بچے انہیں دیکھتے ہی کونوں میں دُبک جاتے۔ کوئی انہیں کچھ نہ کہتا تھا۔ ماموں اونٹ کی طرح بڑبڑاتے ہوئے گلی سے گزر جاتے اور محلے والے انہیں حیرت سے تکتے رہ جاتے۔ ایک ہفتہ یونہی گزر گیا۔ میرے بچے راشد کے شاید ان کا ہاتھ بہت زوردار پڑا تھا، اس لئے یا تو وہ سہم گیا تھا یا پھر اتفاق تھا کہ اسے بخار آگیا تھا۔ ماموں نے جب ایک ہفتے تک اسے گلی میں نہیں دیکھا تو ایک دن وہ موتھہ بناتے ہوئے میرے گھر آئے۔ میں نے مسکرا کر اُن کا استقبال کیا۔ چھوٹتے ہی انہوں نے راشد کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ میں نے اندر کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے التجا کی۔

"دیکھئے ماموں اونٹ، خدا کے لئے اب اسے کچھ نہ کہیں۔ وہ آئندہ آپ کو ماموں اونٹ نہیں کہے گا۔"

اتنا سن کر وہ بُری طرح رونے لگے اور بولے "بچوں نے مجھ سے زبردست انتقام لیا ہے۔ میں ـــــ میں اُن کی آوازیں سننے کے لئے ترس گیا ہوں۔ وہ بلبلوں کی سی آوازیں اب مجھے سنائی نہیں دیتیں۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے انہوں

صدیوں پرانے رسّی کے کرتب کا نیا استعمال

نے مجھے خاموش کر دیا اور بات جاری رکھی "میں تو انہیں یوں ہی مذاق میں ڈانٹتا تھا ـــــ خدا کے لئے مجھے بچے کے پاس لے چلئے۔"

میں نے خاموشی سے اُن کا یہ حکم مانا۔ دل میں میں سوچ رہا تھا کہ اونٹ جتنا بلند جانور ہوتا ہے، ماموں اونٹ کے خیالات بھی اُتنے ہی بلند تھے۔ اونٹ جتنا بڑا ہوتا ہے ماموں اونٹ کا دل بھی اُتنا ہی بڑا تھا۔ راشد کو دیکھتے ہی وہ کھل اُٹھے۔ وہ رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ حلق سے ہنسی کی آوازیں نکل رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ راشد کے سر پر انہوں نے محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور پھر اس سے ضد کرنے لگے کہ وہ انہیں پھر سے ماموں اونٹ کہہ کر پکارے۔ ننھا راشد پہلے تو ذرا جھجکا اور جب اُن کے بار بار اصرار پر جیسے ہی انہیں چلا کر 'ماموں اونٹ' کہا وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ جھک کر انہوں نے راشد کی پیشانی چوم لی۔ راشد نے پھر کہا 'ماموں اونٹ' اور اس بار وہ ہنس ہنس کر محلے والوں کو راشد کو، سبھی بچوں کو اور خاص طور پر مجھے، میرے سامنے ہی بُرا بھلا کہنے لگے۔

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ) ■■

ننھے دماغ، بڑے کارنامے

کے. پی. سکسینہ

نیا سال تمہارے ننھے دلوں میں نئی اُمنگیں جگانے کے لئے آگیا۔ میں یہاں تاریخ عالم کے وہ صفحات تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں جن میں تمہارے جیسے ننھے منّوں کے حیرت انگیز کارنامے درج ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ اپنی کچی عمر میں ہی ان بچّوں نے وہ کارنامے دکھائے ہیں کہ بڑے بڑے حیران رہ گئے۔

پہلی کہانی جرمنی کے ایک نو سالہ بچّے میک کی ہے جس نے نو سال کی عُمر میں دُنیا کی پہلی پنسل ایجاد کی۔ میک ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ ایک دن یوں ہی بے کار بیٹھے بیٹھے اُس نے کوئلے کے سفوف کو لکڑی کی نلی کی شکل میں بھر کر پہلی پنسل بنائی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میک کی بنائی ہوئی کچی پنسلیں تیس تیس رُوپیوں میں بکنے لگیں۔ یہ پنسلیں جنگ کے نقشے بنانے میں کام آتی تھیں۔ وقت گزرتا گیا اور میک کی پنسلیں مقبول ہوتی گئیں۔ آج جرمنی کا سب سے بڑا پنسل کا کارخانہ "میک پنسل کارپوریشن" اس بچّے کی
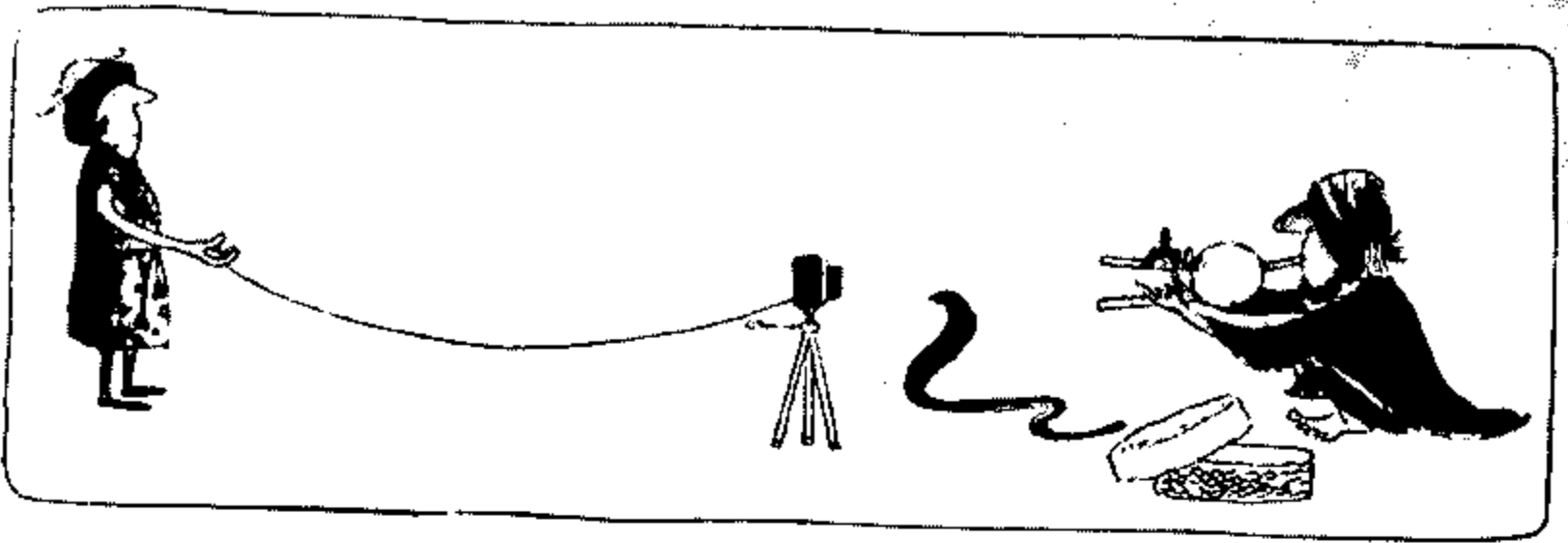
جب ڈر بھی لگے اور سانپ کا فوٹو قریب سے بھی کھینچنا چاہیں ۔

کامیابی کو ظاہر کر رہا ہے ۔

ایسا ہی ایک ہونہار ننھا مچھول ایک جاپانی بچہ یوکوٹاوا تھا، ۱۹۱۷ کی خطرناک باڑھ میں جب کیاموندی کا پانی ہزارہا گھر برباد کر رہا تھا، یوکوٹاوا نے دس سال کی عمر میں کچے بانس اور چمڑے کی مدد سے حیرت انگیز پال بنائے اور سیکڑوں لوگوں کی جان بچائی ۔ جاپان حکومت نے اس بچے کی بہادری پر اُسے ہزارہا انعامات دیئے اور ۱۹۲۲ء میں ملنے نئے جاپانی بیڑے کا نام 'یوکوٹاوا' رکھا ۔ مگر تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ سیکڑوں کی جان بچانے والا یہ بہادر بچہ خود ایک معمولی سے حادثے کا شکار ہوکر ۱۴ برس کی عمر میں جان گنوا بیٹھا ۔

۱۹۲۸ میں شکاگو میں نقب زنی کی وارداتیں بڑھ گئیں تھیں ۔ آئے دن کسی نہ کسی گھر میں چوری ہوتی رہتی تھی ۔ پولیس الگ پریشان ، انہیں دنوں کھیل کھیل میں جارج کرات نامی ایک تیرہ سالہ بچے نے چمڑے کے دھاگے سگریٹ کے خالی ڈبوں اور کنکروں سے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جو دیوار پر ہلکی سی دھمک ہوتے ہی خود بخود بجنے لگتا تھا اور کنکر خالی ڈبوں میں شور مچا کر سونے والوں کو جگا دیتے تھے ۔ آگے چل کر اسی حیرت انگیز آلے کی مدد سے ایک نئی مشین "وائبروگراف" کا وجود ظہور میں آیا ۔ کرات کو اس ایجاد پر کافی انعام ملا ۔

اس سلسلے میں چیکوسلواکیہ کی ننھی منی لڑکی ایڈرینہ کو فراموش کرنا مناسب نہ ہوگا ۔ ایڈرینہ کے پاس ایک خوب صورت گڑیا تھی ۔ ایک دن ایڈرینہ کو کیا سوجھی کہ اُس نے اپنی گڑیا کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا سفوف بھر دیا اور اسے تھوڑا سا ہلانے پر ہی گڑیا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہو جاتے ۔ اب کیا تھا ! راتوں رات رونے والی گڑیا نے دھوم مچا دی ۔ ایڈرینہ نے کچی عمر میں ہی اپنے دماغی کارنامے کے بل بوتے پر کافی پیسہ پیدا کیا ۔

کتے اور بندر کی زبان سے مرہم تیار کرنا آج عام بات ہو چکی ہے ۔ مگر اس اہم ایجاد کا سہرا دراصل پولینڈ کے دس سالہ بچے جوزف کروج کے سر ہے ۔ جوزف نے اپنے گھریلو کتے کو چاٹ چاٹ کر جسم کے زخم ٹھیک کرتے دیکھا ۔ یہ بات جوزف کے دل میں گھر کر گئی ۔ اپنی ننھی بہن کرا بینا کے پاؤں کا زخم تب اُس نے کتے سے چٹوانا شروع کیا ۔ کچھ ہی دنوں میں اُس کی بہن کے پاؤں کا زخم ٹھیک ہوگیا ۔ جوزف کروج نے اس کارنامے کا ذکر اپنے چچا سے کیا جس کی دواؤں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی ۔ کروج کے چچا نے کتے کی زبان سے مرہم

تیار کیا اور سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اس طرح ننھے جوزف کو ایک ایجاد کا فخر حاصل ہوا۔

مشہور عالم سائنس داں گراہم بیل کے دماغ میں ٹیلیفون کی ایجاد کا خواب چھوٹی عمر میں ہی گھر کر گیا تھا۔ اسی طرح نسلِ انسانی پر نئی روشنی ڈالنے والے سائنس داں کا دماغ بھی بچپن سے ہی کارگزاریوں میں مصروف رہتا تھا۔ کچھ یہی حال ہمارے علم نباتات کے ماہر مرحوم جگدیش چندر بوس کا تھا۔ اپنے حیرت انگیز آلے کریسکوگراف (CRESCO GRAPH) کی مدد سے پیڑ پودوں میں زندگی ثابت کرنے والے اس سائنس داں نے اپنے بچپن میں ہی باغ کے پودوں پر سیکڑوں تجربے کر ڈالے تھے۔

خوردبین کے موجد لیووہناک (LEUWENHOCK) نے سب سے پہلے تیرہ برس کی عمر میں کارک کی مہین قاشوں کو آتشی شیشے کی مدد سے پرکھا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس شیشے کی مدد سے وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ سکتا ہے ایک دن اس کا یہ خواب پورا ہوا اور دُنیا آج بھی خوردبین کے لئے اس کی احسان مند ہے۔

کیمیاوی اشیا کی مدد سے نقلی ربر بنانا آج سائنسی معمول ہو چکا ہے۔ ہمارے ملک میں اُتر پردیش کے بریلی ضلع میں نقلی ربر کا ایک عظیم کارخانہ ہے۔ یہ ربر گدّوں اور بستروں میں کام آتی ہے اور مشینوں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ نقلی ربر کا موجد بھی ۱۵ سالہ فرانسیسی بچہ پراندلو کو کہا جاتا ہے۔ ہماری یہ دلی دُعا ہے کہ تمہارے ننھے دماغ بھی ایسے ہی کسی حیرت انگیز کارنامے کے موجد بنیں۔ دُنیا تمہارے کارناموں پر عش عش کر اُٹھے اور تم ملک و قوم کا نام اونچا کر سکو۔ ●●
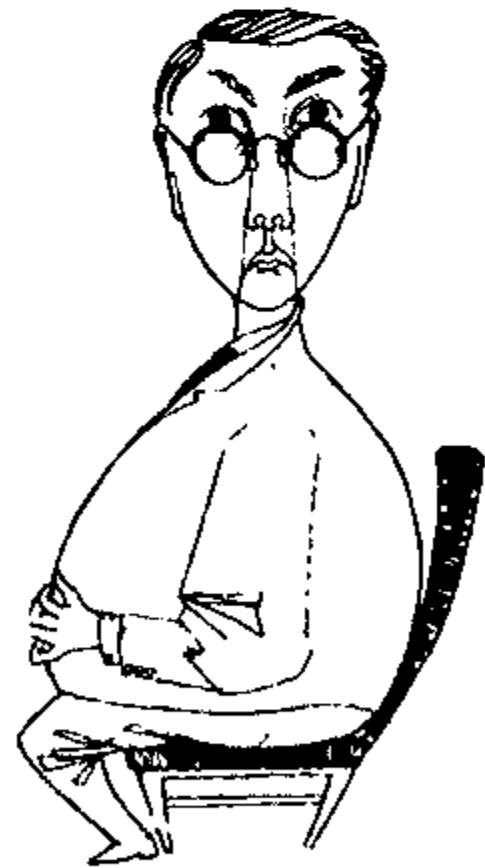
یُوں تو ان کوارٹروں میں پڑھے لکھے سرکاری ملازم ہی رہتے تھے، مگر تین نمبر میں جو جاوید صاحب آئے وہ کچھ مختلف ہی تھے۔ جاوید صاحب تھے تو اسسٹنٹ مگر امورِ خارجہ کی وزارت میں تھے اور تین سال واشنگٹن میں ہندوستان کے سفارت خانے میں رہ کر لوٹے تھے۔ اِس سے پہلے وہ ایران اور جرمنی میں بھی رہ چکے تھے۔ واشنگٹن سے لوٹ کر انہیں اس بلاک میں کوارٹر ملا تھا اور وہ سامان سمیت یہاں آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ جو سامان اُترا، اُسے سب لوگوں نے حیرت سے دیکھا مگر سب سے زیادہ حیرانی بلاک والوں

جنگل کے بندر

م۔م۔ راجندر

آپ غلط کہتے ہیں میرے ڈیڈی کو ملیریا نہیں نمونیہ ہوگیا ہے

کو ٹونی اور جمی کو دیکھ کر ہوئی۔ ٹونی اور جمی دراصل جاوید صاحب کے بارہ سالہ اور چودہ سالہ لڑکے عقیل اور شکیل تھے۔ جنہوں نے امریکہ میں اپنے آپ اپنے نام بدل لئے تھے اور اب جاوید صاحب اور ان کی بیگم بھی انہیں ٹونی اور جمی کہہ کر ہی پکارتے تھے۔

حیرت لوگوں کو اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اُن کے نام ٹونی اور جمی کیوں تھے، بلکہ اس لئے کہ اُن کی وضع قطع اور لباس ہپیوں کی طرح تھے بلاک کے لڑکوں نے ہپی بازاروں اور سڑکوں میں گھومتے تو دیکھے تھے مگر یہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہپی ان کے اپنے بلاک میں بھی رہنے لگیں گے!

پروفیسر کلیم کا لڑکا اختر، بابو رام بہاری کا لڑکا دلنود اور ثنا اللہ صاحب کا لڑکا وحید حیرت کی تصویر بنے ٹونی اور جمی کو دیکھ رہے تھے۔ اور اُن کے بہت قریب آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ٹونی اور جمی کا رنگ بھی گورا چٹا تھا اور تین سال امریکہ میں رہنے کی وجہ سے اُن کا لہجہ امریکنوں کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ ایسی انگریزی بولتے تھے کہ یہ بے چارے لڑکے تو کجا اُن کے ابا بھی، جو سب جاوید صاحب کے استقبال کے لئے یہیں کھڑے تھے، مشکل سے سمجھ سکتے تھے۔ پھر دفتر میں بابو ہونا اور بات ہے اور یورپینوں سے بات چیت میں حصہ لینا دوسری۔ جاوید صاحب سے تو ان لوگوں نے کچھ بات کی مگر ٹونی اور جمی سے بات کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ اس وقت بھی ٹونی اور جمی کے کندھوں پر ایک ایک چھوٹا سا گٹار لٹکا ہوا تھا اور وہ اپنے نئے کوارٹر اور پڑوسیوں کو اس انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے اس جگہ پر اور ان لوگوں کے ساتھ گذارہ بڑی مشکل سے ہوگا۔

ٹونی اور جمی دونوں لمبے قد کے لڑکے تھے، اور اگرچہ موٹے نہ تھے۔ مگر تندرستی ایسی تھی کہ بلاک کے کسی ہم عمر لڑکے کو مکا ماردیں، تو وہ بلبلے کی طرح پچک جائے۔ بال عورتوں کی طرح لمبے تھے اور ہر وقت ایسے چمکتے اور لہراتے تھے جیسے روز شیمپو سے دھلتے ہوں۔ ان بالوں کے پیچھے کبھی کبھی وہ پن اور کلپ بھی لگالیتے اُن کی قلمیں سلطانہ ڈاکو کی قلموں کی طرح ٹھوڑی تک نیچی اور ڈیڑھ ڈیڑھ انچ موٹی تھیں۔ ظاہر ہے اس چھوٹی عمر میں چہرے پر بال اُگنے کا تو سوال ہی نہیں تھا مگر ٹونی اور جمی یہ قلمیں ایک خاص قسم کے پینٹ اور برش سے چند لمحوں ہی میں ایسی بنا لیتے تھے کہ اصلی بالوں کی کیا ہوں گی جس روز اُترے تھے تو انہوں نے سمندری لٹیروں کا لباس پہنا ہوا تھا جس میں تلوار کی بجائے گٹار لٹکا ہوا تھا۔ بہت تنگ اور رانوں پر منڈھی ہوئی بے جیب اور بٹن کی کالی پتلون اس پر آٹھ انچ چوڑی پیٹی جس کے بیچ میں دس انچ گولائی کا سفید بکسوا اور اوپر بہت مہین جالی کا سُرخ کرتے نما بلاؤز جس کی آستینیں ہاتھوں کے نزدیک بالکل بند تھیں اور سے اتنی چوڑی کہ لڑکیوں کے غرارے بھی نہیں ہوتے ہوں گے اور غضب یہ تھا کہ کانوں پر کلپ سے بڑی بڑی سُنہری بالیاں بھی لٹکا رکھی تھیں۔

جب اس بلاک میں آئے ہوئے انہیں کچھ دن ہو گئے تو وہ امپوریم سے عجیب و غریب گہرے رنگوں والے کچھ ایسے کپڑے لے آئے تھے جو ناگالینڈ کے قبیلوں میں مستورات پہنتی ہیں انہیں اپنے آپ کاٹ کر اور سی کر انہوں نے اپنی پسند کا بنا لیا تھا ٹونی نے اپنے کرتے پر بڑا سا دل پینٹ کر لیا، جس کے بیچ میں ایک تیر گھسا ہوا تھا اور جمی نے اپنے کرتے پر یہ لفظ اپنے سینے پر

انگریزی میں لکھوا لئے۔ یہ دل محبت کا بھوکا ہے۔"

ٹونی اور جمی انگریزی اسکولوں میں داخل ہو گئے تھے انہوں نے بلاک کے کسی لڑکے سے راہ و رسم بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ اختر اور وحید نے ایک دو دفعہ "السلام علیکم" کہا اور دونوں نے نمستے کی، مگر وہ "مارننگ" کہہ کر آگے بڑھ گئے اور اختر اور وحید بعد میں یہ بحث کرنے لگے "گڈ مارننگ" اور "مارننگ" میں کیا فرق ہے! ٹونی اور جمی یا تو ادھر اپنے گھر میں رہتے یا پھر گھر سے باہر، اور اکثر اپنی ممی سے شکایت کرتے کہ یہ بلاک کتنا پس ماندہ ہے کہ یہاں نہ کوئی لڑکی نظر آتی ہے نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ وہ اونچی آواز میں گھر میں تقریباً ہر وقت انگریزی کے رومانی گانے گٹار پر یا اس کے بغیر گاتے رہتے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی شرم نہیں کرتے تھے اور اکثر انہیں کھلی چھت پر گٹار بجاتے اور گاتے اور ناچتے دیکھا گیا تھا۔ جب وہ چھت پر گاتے اور ناچتے تو عورتیں تک اپنی اپنی چھت پر چڑھ کر دیکھنے لگتیں اور بچوں کی تو بھیڑ لگ جاتی۔

اختر کو ٹونی اور جمی دونوں بہت اچھے لگتے تھے اور وہ انہیں دوست بنانا چاہتا تھا۔ ایک روز جب ٹونی اور جمی اپنی چھت پر ناچ رہے تھے تو اختر ہمت کر کے اپنی چھت سے ان کی چھت پر پہنچ گیا۔ اختر میں ایک خوبی تھی کہ وہ بھی کافی خوب صورت تھا اور فلمی گانے گاتا تھا، مگر انگریزی تو وہ اتنی جانتا تھا جتنا آٹھویں کلاس کا بچہ آج کل جانتا ہے۔ اختر غور سے ٹونی اور جمی کے گانے سنتا رہا جو ساتھ ساتھ ناچ بھی رہے تھے اور اس پر ایک سحر سا طاری ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ ان جیسا بن سکے۔

اختر نے اپنے لباس کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ اب قمیص اور پینٹ زیادہ پہنتا تھا اور اپنے بالوں

"کیا کریں صاحب ہسپتال میں اسٹاف کم ہے!"

کو ایک خاص ڈھنگ سے بنانے لگا تھا۔ اس نے اپنی امی سے کہہ کر ایک ٹائی بھی منگوا لی۔ اس طرح وہ بلاک کے لڑکوں میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک بن گیا۔ اس نے تنہائی میں ٹونی اور جمی کے انداز میں ان کے انگریزی گانوں کی ایک دو لائنیں گانے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ اس نے ٹونی سے دوستی کر لی۔ اور پھر ٹونی اور جمی دونوں ہی اسے اپنے پاس بٹھانے لگے۔ اس دوستی کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ اختر بھی ان ہی کے انداز میں انگریزی بولنے لگا۔ بلاک کے دوسرے لڑکے اختر سے الگ سے ہو گئے اور اختر خود اپنے آپ کو ان سے برتر سمجھنے لگا۔ ایک روز تو سارے بلاک والے حیران رہ گئے جب ٹونی اور جمی کی طرح اختر نے بھی ٹونی کا گٹار لے کر ان کی چھت پر ان ہی کی طرح جھوم جھوم کر ایک گانا سنایا! بچوں نے دوڑ کر اختر کی امی کو خبر کر دی اور اختر کی امی اختر کو گٹار بجاتے اور انگریزی گانا گاتے اور ناچتے دیکھ کر پھولی نہ سمائی۔ اس روز ٹونی نے اختر سے انگریزی میں پوچھا "ڈک تمہیں اپنے بال بڑھانے میں کیا اعتراض ہے؟ اور اس لباس کو بھی بدل لو۔"

اختر کا نام انہوں نے ڈک رکھ دیا تھا اور اختر اپنا یہ نام سن کر بڑا خوش ہوتا تھا۔ اختر تو دل سے ان جیسے ہی بال رکھنا چاہتا تھا مگر ابا، امی اور بھیا سے ڈر لگتا تھا۔ ان سب میں امی ہی ایسی تھیں جو شاید اپنے بے انتہا لاڈ، پیار کی وجہ سے

اس کی بات مان لیتیں ۔ اختر نے پہلا کام تو یہ کیا کہ پندرہویں دن جو بال کٹوانا تھا تو اب کے نہیں کٹوائے اور ایسے تین پندرہواڑے گزر گئے ، یہاں تک کہ اس کی گردن بالوں سے بھر گئی اور کان بھی بالوں سے ڈھک گئے ۔ اس نے انہیں اب لڑکیوں کی طرح بنانا شروع کر دیا پھر اس نے امی سے ضد کر کے ایک رنگین کرتا بنوا لیا اور اس کرتے پر پیٹھ کی طرف ٹونی سے ایک بڑا سا دل پینٹ کرا لیا اور ٹونی نے اس کے بیچ میں یہ لفظ انگریزی میں لکھ دیے ۔
"دل دے کر دیکھو"

اختر اپنے ابا سے بہت ڈرتا تھا اور یہ کرتا اسکول سے آنے کے بعد ٹونی اور جمی کے ساتھ گٹار بجانے اور ناچنے گاتے کے لئے ہی استعمال کرتا تھا ۔ اس کے بال اب اتنے بڑھ گئے کہ وہ بالکل لڑکی لگتا تھا ۔ مگر وہ ابا کے سامنے اتنا کم آتا کہ ان کی توجہ اس کے بالوں کی طرف نہیں گئی تھی ۔ ویسے بھی پروفیسر صاحب اپنی ہی کتابوں میں غرق رہا کرتے تھے ۔ اب اختر فلمی پینٹ کرنا بھی سیکھ گیا تھا اور اپنے حلیئے سے ٹونی اور جمی کا بھائی ہی معلوم ہوتا تھا ۔

اختر کے ابا کو اختر کی نوماہی رپورٹ ڈاکیے نے ان کے کالج میں ہی دے دی اور وہ اسے پڑھ کر چکرا گئے ۔ ہمیشہ اعلیٰ نمبروں سے پاس ہونے والا اختر انگریزی ، حساب اور تاریخ میں فیل تھا ۔ رپورٹ ہاتھ میں لئے گھر آ رہے تھے تو اختر کے کلاس ٹیچر ماسٹر حکم چند مل گئے ۔ انہوں نے بتایا کہ اختر کئی مہینوں سے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا اور اس نے لڑکیوں کی طرح اپنے بال بڑھا رکھے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہی حال رہا تو سالانہ امتحان میں پاس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ سن کر اختر کے ابا کو بڑا طیش آیا ۔ ایک دفعہ انہیں یہ شکایت تو ملی تھی کہ اختر ٹونی اور جمی کی صحبت میں پڑ گیا ہے مگر آج یہ بھی پتہ لگا کہ وہ تو ان کی طرح ناچتا اور گاتا بھی ہے ۔ وہ آگ بگولہ ہو کر گھر میں داخل ہوئے اور اختر کو آواز دی ۔ اختر گھر پر ہی تھا ۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ نوماہی امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا ہے ، اور وہ چارپائی پر پڑا اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا ۔ ڈر کے مارے وہ وہیں پڑا رہا ۔ اس کی امی نے ابا کا غصہ دیکھ کر کہہ دیا کہ میں نے اختر کو بازار بھیجا ہے"

اختر کے ابا بولے " دیکھ لیے اپنے لاڈلے کے کرتوت ۔ تینوں مضمونوں میں بُری طرح فیل ہوا ہے ۔ اس کو بگاڑنے کی ذمہ داری تم پر ہے ۔ یہ ٹونی اور جمی کی نقل کر کے ہپی بن گیا ہے ۔ اپنی تہذیب اپنی شرافت سب بھول گیا ۔ یہ ہپی شاید اپنے آپ کو بڑا مہذب سمجھتے ہوں گے مگر میں تو انہیں جنگل کے بندر سمجھتا ہوں ، خود جاوید صاحب مجھ سے چند دن ہوئے ٹونی اور جمی کی شکایت کر رہے تھے ۔ افسوس آزاد ہو کر بھی ہماری ذہنیت نہیں بدلی ۔ اگر اختر نے اسی وقت توبہ نہ کی اور اپنی پڑھائی کی طرف دھیان نہیں دیا تو اس کی خیر نہیں ، ورنہ میں تم سے بولوں گا ۔ میں اس معاملے میں بڑا سخت ہوں "

اختر کے ابا یہ کہہ کر غصے میں اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ انہوں نے چائے تک نہیں پی ۔ اختر نے سب کچھ سن لیا تھا ۔ وہ اپنی امی سے بے حد پیار کرتا تھا اور اس بات سے اُسے دکھ ہوا کہ اس کی وجہ سے ابا امی سے بھی ناراض ہو گئے ہیں ۔ وہ اگر فیل ہوا تھا تو اسی وجہ سے کہ اس نے ٹونی اور جمی کی صحبت میں پڑ کر ایک دن بھی کتاب اُٹھا کر نہیں دیکھی تھی ۔ اپنے وطن اور اس کی تہذیب پر کسے ناز نہیں ہوتا ۔ وہ تو واقعی ایک نقل کرنے والا بندر بن گیا تھا ۔ اس کی امی اس کے کمرے میں آئیں تو وہ اُن سے لپٹ کر رونے لگا ۔ پھر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور امی سے پیسے لے کر بال کٹوانے چلا گیا ۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بال کٹوا کر اور اپنا حلیہ ٹھیک کر کے ہی وہ ابا کے سامنے آئے گا اور آئندہ ایک اچھا لڑکا بننے کا عہد کرے گا ۔

●●●

جگن ناتھ آزاد

بوجھو تو جانیں

۱

کون سی چیز ہے بتا تو ذرا
ہڈیوں پر اُگے ہوں جس کے بال
ہاں لیکن نظر نہیں آتے
کیونکہ اُن پہ چڑھی ہوئی ہے کھال

۲

خوب صورت ہری بھری اک چیز
موتیوں سے جڑی ہوئی دیکھی
باغ میں اک دوشالہ اوڑھے ہوئے
ہم نے اکثر کھڑی ہوئی دیکھی

ہنسی مشق

اطہر افسر

ایک راستے کے کنارے "دوسرا" آدمی کھڑا ہے
ایک طرف سے "پہلا" آدمی اطمینان سے چلتا ہوا
آتا ہے۔

پہلا آدمی : میں نے کہا آداب عرض ہے۔

دوسرا آدمی : آداب عرض ہے جناب آداب عرض ہے، فرمایئے مزاج کیسا ہے ؟

پہلا آدمی : بہت اچھا ہے، آپ کا مزاج ؟

دوسرا آدمی : نہایت خراب ہے۔

پہلا آدمی : ارے کیوں، کیوں وہ کیوں ؟

دوسرا آدمی : سخت سردی ہے، نزلہ کھانسی اور بخار کا

مجھے افسوس ہے کہ آپ ۸ مئی ۱۹۸۰ تک
ڈاکٹر صاحب سے نہیں مل سکتے وہ بہت مصروف ہیں

شکار ہوگیا تھا، بُخار تو چلا گیا، نزلہ اور کھانسی باقی ہے۔

پہلا آدمی : حیرت ہے۔

دوسرا آدمی : اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ حیدرآباد میں ان دِنوں سخت سردی پڑ رہی ہے۔

پہلا آدمی : جی ہاں سُنا تو ہے۔

دوسرا آدمی : سُنا تو ہے۔ کیا مطلب؟ کیا آپ حیدرآباد میں نہیں رہتے؟

پہلا آدمی : جی ہاں رہتا ہوں۔ حیدرآباد ہی میں رہتا ہوں۔

دوسرا آدمی : جناب بڑے بزرگوں کا کہنا ہے کہ حیدرآباد میں اس سال اتنی سخت سردی پڑ رہی ہے کہ پچھلے تیس چالیس برسوں میں ایسی سردی نہیں ہوئی۔

پہلا آدمی : شاید۔

دوسرا آدمی : شاید؟ کیا مطلب؟

پہلا آدمی : شاید اس لئے کہ میری عمر صرف اٹھائیس سال ہے۔ تیس سال کی باتوں سے میں کیسے واقف ہوسکتا ہوں۔

دوسرا آدمی : اچھا اچھا لیکن شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ اس سردی کا اثر بچے، بوڑھے، جوان، مرد عورت سب پر ہوا ہے۔

پہلا آدمی : سب پر ہوا ہے۔

دوسرا آدمی : ہاں تھوڑا بہت تو ہر شریف آدمی پر۔

پہلا آدمی : میں تو اب تک محفوظ ہوں۔

دوسرا آدمی : خدا آپ کو محفوظ ہی رکھے۔

پہلا آدمی : (ہنستا ہے)

دوسرا آدمی : آپ ہنس رہے ہیں!

پہلا آدمی : جی ہنس نہیں رہا ہوں۔

دوسرا آدمی : پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟

پہلا آدمی : ہنسنے کی مشق کر رہا ہوں۔

دوسرا آدمی : مشق۔ وہ کیوں؟

پہلا آدمی : جی ایسا ہوتا ہے اکثر لوگ ہنسنے کی باتیں کرتے ہیں، لطیفے سُناتے ہیں۔

دوسرا آدمی : لطیفے سُناتے ہیں آپ کو

پہلا آدمی : جی ہاں کیوں آپ کو یقین نہیں آرہا ہے۔

دوسرا آدمی : جی نہیں، آرہا ہے، آرہا ہے، فرمائیے۔

پہلا آدمی : راستہ روک روک کر لطیفے سناتے ہیں۔

دوسرا آدمی : اچھا۔

پہلا آدمی : مگر مجھے ہنسی نہیں آتی۔ لوگوں کو بڑی شرمندگی ہوئی ہے۔

دوسرا آدمی : پھر۔

پہلا آدمی : جب لوگوں کو شرمندگی ہوتی ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔

دوسرا آدمی : تو پھر۔

پہلا آدمی : اس لئے انہیں شرمندگی سے بچانے کے لئے میں اس وقت ہنسنے کی مشق کر رہا ہوں ۔
دوسرا آدمی : تاکہ لوگ لطیفے سنائیں تو آپ ہنس سکیں ۔
پہلا آدمی : جی ہاں' اب یہی دیکھئے نا پرسوں ایک آدمی نے دس بارہ لطیفے سُنائے ، لوگوں نے خوب قہقہے لگائے ، خوب تعریفیں کیں ، خوب ہنسے ۔
دوسرا آدمی : آپ نہیں ہنسے ۔
پہلا آدمی : جی نہیں ۔
دوسرا آدمی : وہ کیوں ۔
پہلا آدمی : جو آدمی لطیفے سنا رہا تھا اس سے میری لڑائی ہے'
دوسرا آدمی : اجی جناب لطیفے تو ایسی چیز ہیں کہ اچھے ہوں' تو خوب کُھل کر تعریف کرنی چاہیئے ، قہقہے لگانے چاہئیں ۔
پہلا آدمی : قہقہے تو میں نے لگائے ۔
دوسرا آدمی : کب ۔
پہلا آدمی : اپنے گھر جانے کے بعد ، تنہائی میں میں نے خوب لُطف لیا ، لطیفوں کو یاد کرتا گیا اور ہنستا گیا ۔
دوسرا آدمی : واقعی آپ کو ہنسنے کی مشق کی ضرورت ہے تاکہ آپ ہر جگہ اور ہر لطیفے پر ہنس سکیں ۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جائے گی ۔
پہلا آدمی : جی ہاں ۔
دوسرا آدمی : تو ایک آدمی بنک میں گیا ۔
پہلا آدمی : (ہنستا ہے)
دوسرا آدمی : آپ کیوں ہنس رہے ہیں ؟
پہلا آدمی معاف فرمایئے میں سمجھا آپ کوئی لطیفہ سنا رہے ہیں ۔
دوسرا آدمی : لطیفہ تو سُنا رہا ہوں ، مگر
پہلا آدمی : خیر خیر' سنایئے سُنایئے ۔

یہ پرائیویٹ جاسوس واقعی ہمارے منے کو بڑی محنت سے تلاش کر رہا ہے

دوسرا آدمی : اطمینان سے سنیئے ، اس کے بعد ہنسیئے ۔
پہلا آدمی : فرمایئے ۔
دوسرا آدمی : ایک آدمی بنک میں گیا ۔ اس نے اپنی جیب سے چیک نکال کر کھڑکی میں سے کلرک کو دیا ۔
پہلا آدمی : اب ہنسوں ۔
دوسرا آدمی : نہیں ۔
پہلا آدمی : لطیفہ ابھی ختم نہیں ہوا ؟
دوسرا آدمی : ختم ہو نا کیا ، لطیفہ ابھی ابھی شروع ہوا ہے ۔
پہلا آدمی : اچھا اچھا ۔
دوسرا آدمی : سب بھلا دیا آپ نے ۔
پہلا آدمی : مجھے یاد ہے ۔ ایک آدمی نے چیک جیب سے نکال کر کھڑکی میں سے بنک کے کلرک کو دیا ۔
دوسرا آدمی : ہاں ہاں آدمی نے چیک کھڑکی میں سے بنک کے کلرک کو دیا ۔
پہلا آدمی : پھر ۔
دوسرا آدمی : بنک کے کلرک نے چیک کو اِدھر اُدھر سے دیکھا اور بولا ، یہ چیک کیش نہیں ہو سکتا ۔
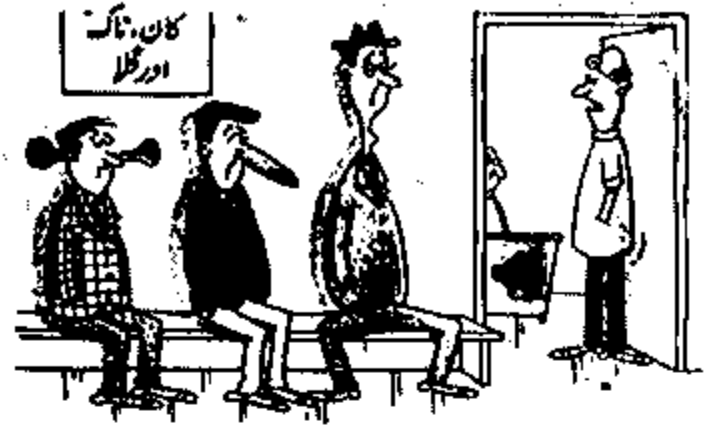
آج جو مریض آئے ہیں اُن کا فوٹو
تو ہم اشتہار کے طور پر استعمال
کرسکتے ہیں

پہلا آدمی : (ہنستا ہے)
دوسرا آدمی : پھر آپ ہنسنے لگے۔
پہلا آدمی : ہنسنا نہیں چاہیے۔
دوسرا آدمی : ہنسنا چاہیئے ضرور چاہیے، مگر ابھی نہیں۔
پہلا آدمی : پھر کب ہنسنا چاہیئے۔
دوسرا آدمی : جب کہ لطیفہ ختم ہو جائے۔
پہلا آدمی : تو ابھی لطیفہ ختم نہیں ہوا۔
دوسرا آدمی : نہیں۔
پہلا آدمی : اچھا سنائیے۔
دوسرا آدمی : سب بھول گیا، میں آپ کو کیا سنا رہا تھا
پہلا آدمی : مجھے یاد ہے، ایک آدمی بنک میں گیا، پھر اُس آدمی نے اپنی جیب میں سے چیک نکال کر بنک کے کلرک کو دیا۔
دوسرا آدمی : کھڑکی میں سے۔
پہلا آدمی : جی ہاں اُس آدمی نے اپنی جیب سے چیک نکال کر کھڑکی میں سے بنک کے کلرک کو دیا۔
دوسرا آدمی : پھر۔
پہلا آدمی : بنک کے کلرک نے چیک کو اِدھر اُدھر سے دیکھا۔

دوسرا آدمی : پھر۔
پہلا آدمی : بنک کے کلرک نے چیک کو اِدھر اُدھر سے دیکھا اور بولا یہ چیک کیش نہیں ہو سکتا۔
دوسرا آدمی : پھر۔
پہلا آدمی : پھر؟
دوسرا آدمی : ہاں پھر کیا ہوا۔
پہلا آدمی : جی اس کے بعد کیا ہوا، مجھے اس کا پتہ نہیں۔
دوسرا آدمی : کیسے پتہ نہیں۔
پہلا آدمی : اس لئے پتہ نہیں کہ میں اس وقت موجود نہیں تھا
دوسرا آدمی : یہ تو میں جانتا ہوں آپ اُس وقت موجود نہیں تھے مگر اس آدمی نے کیا کہا آپ کو معلوم ہونا چاہیئے
پہلا آدمی : کیسے؟
دوسرا آدمی : ایسے کہ میں نے بتایا ہوگا۔
پہلا آدمی : جی نہیں آپ نے نہیں بتایا، آپ نے بس اتنا ہی سنایا کہ
دوسرا آدمی : کیا سنایا۔
پہلا آدمی : یہی کہ بنک کے کلرک نے چیک کو اِدھر اُدھر سے دیکھ کر کہا یہ چیک کیش نہیں ہو سکتا۔
دوسرا آدمی : اس کے آگے نہیں سنایا۔
پہلا آدمی : جی نہیں۔
دوسرا آدمی : تو سنو، جب بنک کے کلرک نے اُس آدمی سے کہا کہ یہ چیک کیش نہیں ہو سکتا تو آدمی نے بنک کے کلرک سے پوچھا، کیوں، کیوں کیش نہیں ہو سکتا۔
پہلا آدمی : لازمی بات ہے۔
دوسرا آدمی : بنک کے کلرک نے کہا یہ چیک کراس ہے آدمی بولا کھڑکی میں سے تو کراس ہی آئے گا۔ اُدھر

سے اُکر دے دوں۔

پہلا آدمی : جی پھر۔

دوسرا آدمی : (پسینہ پونچھتا ہے) پھر کیا، لطیفہ ختم ہو گیا۔

پہلا آدمی : ختم ہو گیا۔

دوسرا آدمی : ہاں ہنستے کیوں نہیں۔

پہلا آدمی : غلطی ہو گئی معاف کر دیجئے (ہنستا ہے) دیکھئے اس لئے میں صبح سے ہنسنے کی مشق کر رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کل رات سیکنڈ شو میں ایک آدمی اُوپر سے ہال میں گر پڑا۔

دوسرا آدمی : اچھا۔

پہلا آدمی : جی ہاں جتنے لوگ سنیما ہال میں بیٹھے ہوئے تھے سب کے سب ہنسنے لگے۔

دوسرا آدمی : سب ہنسنے لگے؟

پہلا آدمی : جی ہاں سب کے سب ہنسنے لگے سوائے میرے۔

دوسرا آدمی : کیوں تم کیوں نہیں ہنسے۔

پہلا آدمی : وہ گرنے والا میں ہی تھا۔

دوسرا آدمی : اُوہ۔

پہلا آدمی : اچھا میں اب چلتا ہوں۔

دوسرا آدمی : خدا حافظ۔

پہلا آدمی : اتنا بتا دیجئے، جب میں آپ سے ملا تو میں اِس طرف سے آیا تھا یا اُس طرف سے۔

دوسرا آدمی : اُس طرف سے۔

پہلا آدمی : اور اس کا مطلب ہے میں دوپہر کا کھانا کھا چکا ہوں، شکریہ۔

دوسرا آدمی : شکریہ (دوسرا آدمی قہقہہ لگاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

●●●

10x2=
4+1=
6x3=
5-3=
ماسٹر جی "مجرم" پڑھ رہے ہیں اتنے تم
مجھے جواب نقل کرا دو

فرخ اور محسن باغ میں کھیل رہے تھے۔ جب فرخ نے محسن سے کہا کہ چلو ماسٹر جی پڑھانے کے لئے آنے والے ہوں گے تو محسن نے جواب دیا کہ آج دل نہیں چاہ رہا، میں تو بیماری کا بہانہ کر دوں گا

بہانہ

کام کرنے والے:
فرخ دہلوی، محسن دہلوی اور
نیاز احمد صاحب

فوٹوگرافی: سراج انور
ہدایات: الیاس دہلوی

ماسٹر صاحب آئے تو محسن بیمار بن کر لیٹ گیا اور فرخ اُس کا سر دبانے لگی

فرخ نے ماسٹر جی کو بتایا کہ آج محسن نہیں پڑھے گا۔ اسے بخار بھی ہے اور سر میں درد بھی

ماسٹر صاحب کو بڑا افسوس ہوا اور وہ کہنے لگے۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔ آج میں نے ایم اے کے امتحان میں پاس ہونے کی خوشی میں اپنے سب شاگردوں کی دعوت کی تھی۔ اب بھلا محسن کس طرح اس میں شریک ہو سکتا ہے

وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے اور بے چارہ محسن جھوٹا بہانہ بنانے کے رنج میں بُری طرح رونے لگا

●●

بہادر لڑکا

کام کرنے والے : ساجد دہلوی، مسعود عمر، نیاز احمد اور دوسرے

فوٹوگرافی : سراج انور

ہدایات : الیاس دہلوی
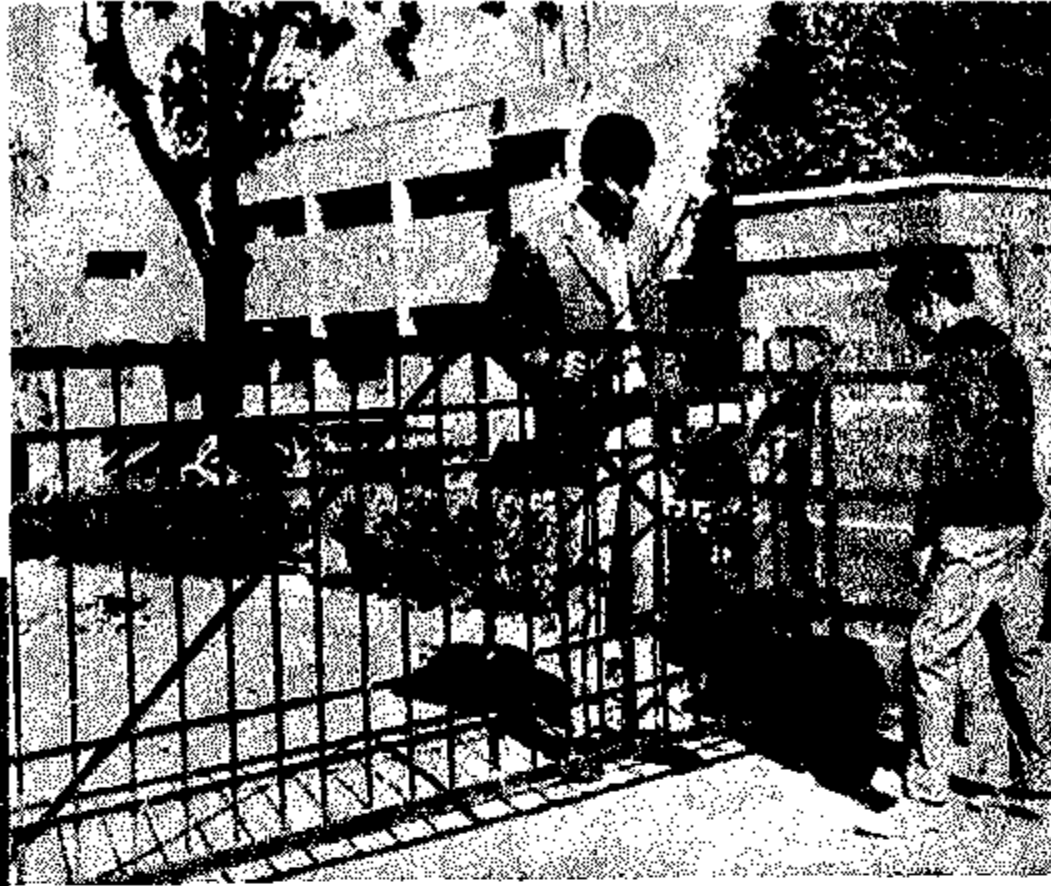
ساجد روزانہ اسکول دیر سے پہنچتا تھا، ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے دروازے پر ہی روک لیا اور کہا کہ واپس جاؤ، تم کلاس میں نہیں جا سکتے"

ساجد بڑا پریشان ہوا اور اس نے دیوار پر چڑھ کر اندر اسکول میں کود جانے کی ٹھانی
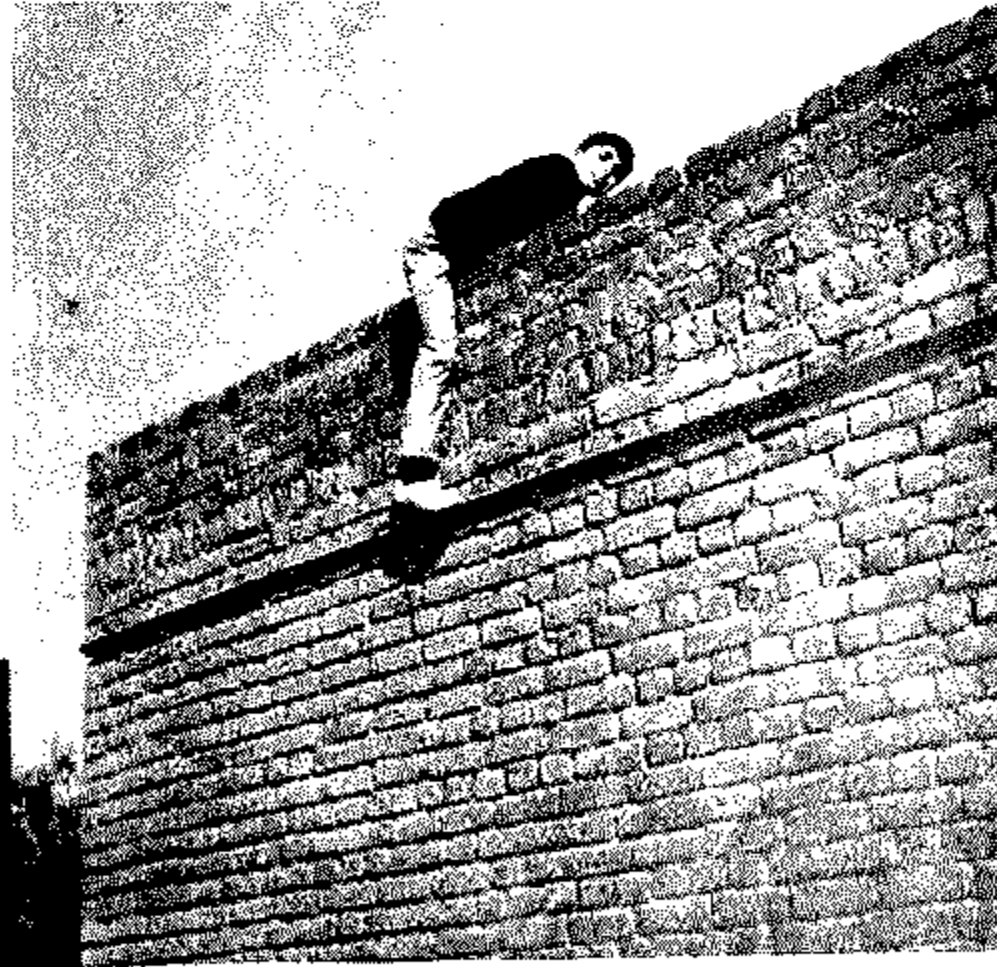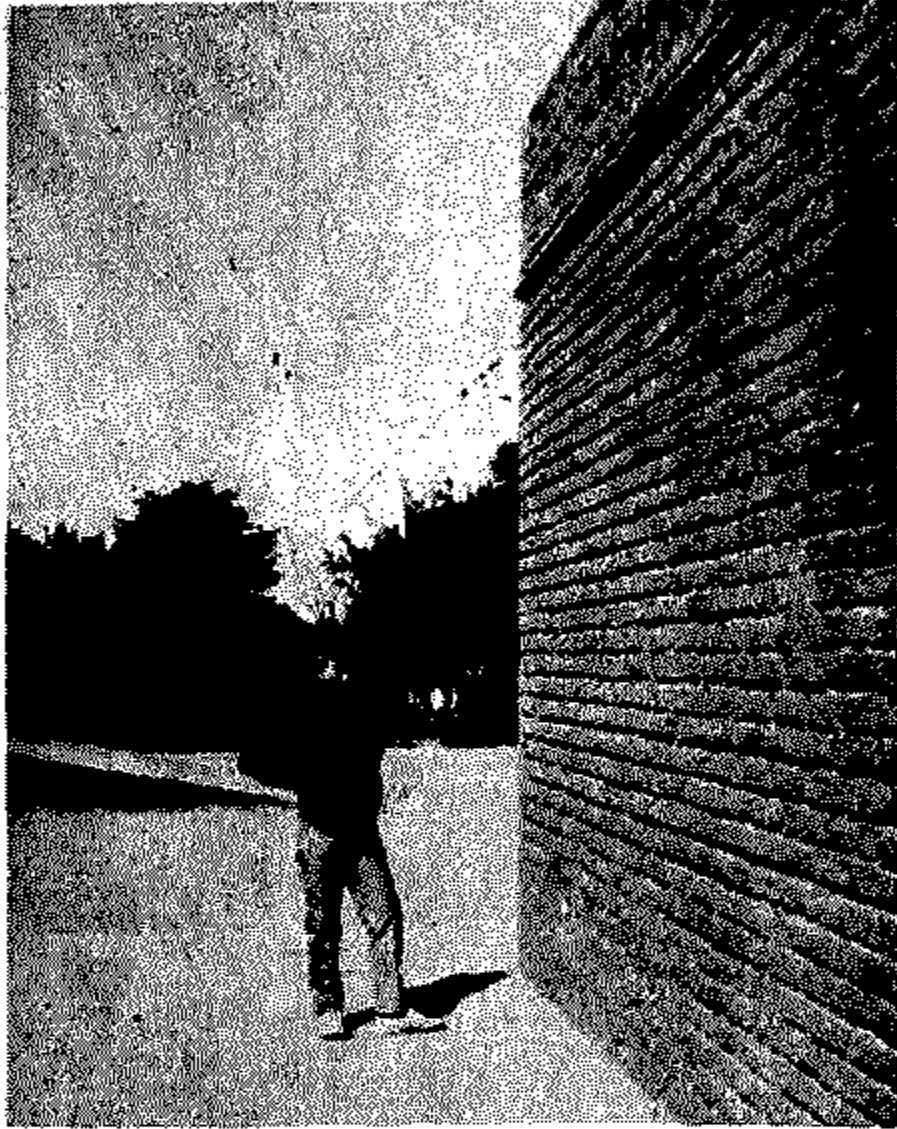
بڑی مشکل کے بعد وہ دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن ایک ٹانگ اوپر اٹھانے میں بہت دشواری ہو رہی تھی

"اتفاق سے ہیڈ ماسٹر صاحب دیوار کے نیچے سے گزر رہے تھے اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ایک بدمعاش نے انہیں
روک لیا اور چاقو دکھا کر بولا ــــ "جتنی بھی رقم ہے فوراً نکال دو"

اچانک کوئی چیز بدمعاش پر دھڑام سے آکودی ــــ یہ ساجد تھا
جو دیوار پر چڑھنے میں کام یاب نہ ہوسکا تھا اور نیچے گر پڑا تھا
ہیڈ ماسٹر صاحب جلدی سے بدمعاش کو پکڑنے کے لئے جھکے

اور پھر دونوں نے مل کر بدمعاش کی مشکیں کس لیں اور پھر بعد میں
اسے پولیس کے حوالے کر دیا

کہاں تو ہیڈ ماسٹر صاحب ساجد کو زہریلی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور
کہاں وہ اب ان کے گھر میں بیٹھا دعوت اڑا رہا تھا
یہ دعوت ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی جان بچ جانے کی خوشی میں کی تھی

اور ساجد کو بہادر لڑکے کا خطاب دیا تھا۔ اس کی کلاس کے بقیہ لڑکے دروازے میں
حیرت زدہ کھڑے ہوئے رال ٹپکا رہے تھے ■ ■

انور نے اپنے دوست فرید کو ایک خط دکھایا ▲
جس میں اُسے چند لڑکے اور لڑکیوں نے اپنے گھر دعوت پر بلایا تھا
لڑکے سب اجنبی تھے، مگر انوار جانے کے لئے راضی ہو گیا

◀ اُس نے جلدی جلدی پُرانا اور ڈھیلا سا کوٹ پہنا

پھر جوتے کے بند باندھے اور
اچھی طرح تیار ہو کر دعوت والے گھر کی طرف چل پڑا ▼

[illegible]

▶ دیکھا کہ وہاں شریر لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی
پہلے ہی سے کھڑی ہوئی ہے۔ ان سب نے انوار کا مذاق
اڑاتے ہوئے کہا — "آیئے آیئے حضور — تشریف لایئے"

◀ انوار نے خط دکھاتے ہوئے کہا
کہ آپ نے مجھے دعوت کے لئے بلایا تھا مگر ایک لڑکے
نے کہا — "اجی حضور کیسی دعوت؟ — ہمیں تو
صرف یہ دیکھنا تھا کہ اتنا واہیات
اور چھوٹا سا کوٹ کون احمق پہنتا ہے؟"

▶ میرے والد کی لانڈری کی دکان تھی
اور وہاں یہ کوٹ دُھلنے آیا تھا۔ اب میں نے پتہ نوٹ کر کے
تمہیں خط ڈال دیا — بیچارہ انوار یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا
اور دل ہی دل میں اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہوتا رہا ■ ■

وسیم آرام سے بیٹھا
پڑھ رہا تھا کہ ایک مکھی نے اُسے
ستانا شروع کر دیا
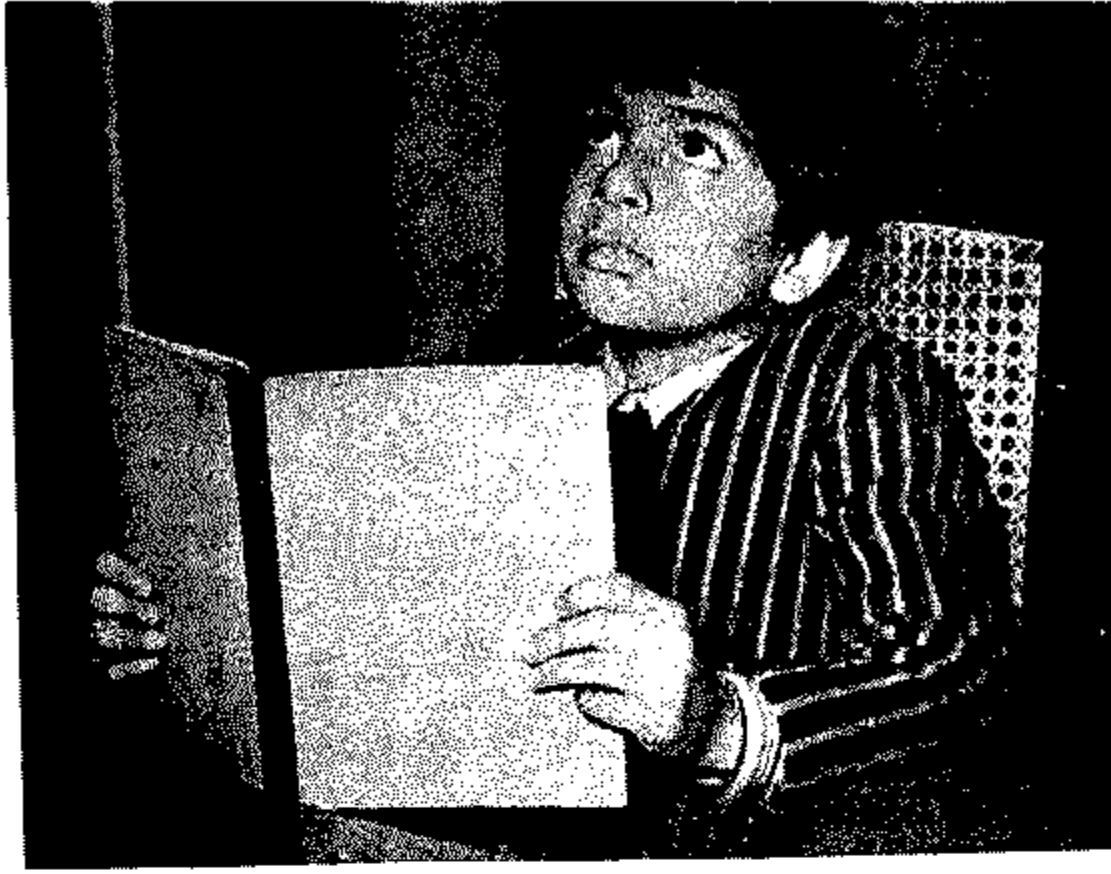
کان پر آکر اُس نے بین بجانی چاہی تو وسیم نے
اُسے اُڑا دیا

مگر مکھی بہت ڈھیٹ تھی۔ وسیم نے بھی سوچا کہ
اس کی خبر لی جائے
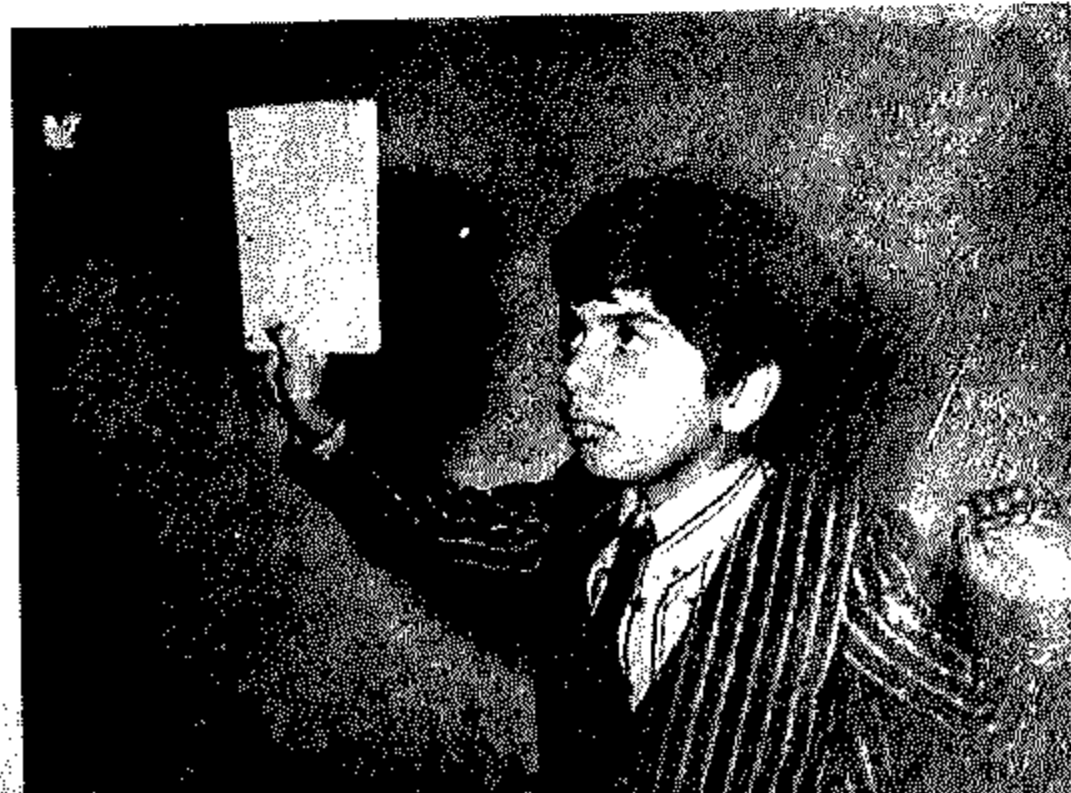
کام کرنے والے:
وسیم دہلوی ، محبوب الرحمان
فوٹوگرافی:
سراج انور
ہدایات:
الیاس دہلوی

وہ دیوار پر بیٹھ گئی
تو وسیم نے اُسے ٹانکا
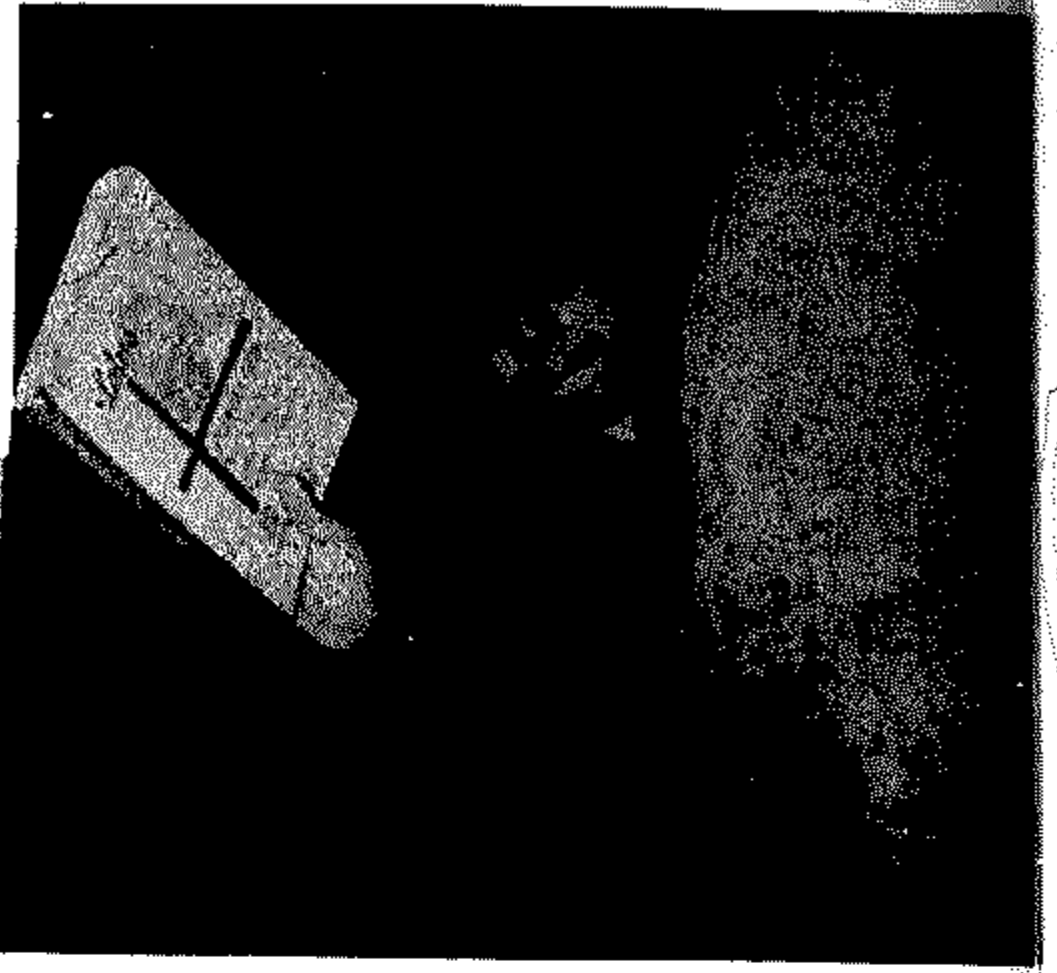
اور پھر نشانہ باندھ کر اُس نے کاپی کے
ذریعے اُسے دیوار سے چپکا دیا۔ دیوار پر کچھ عجیب
سے نشان بن گئے
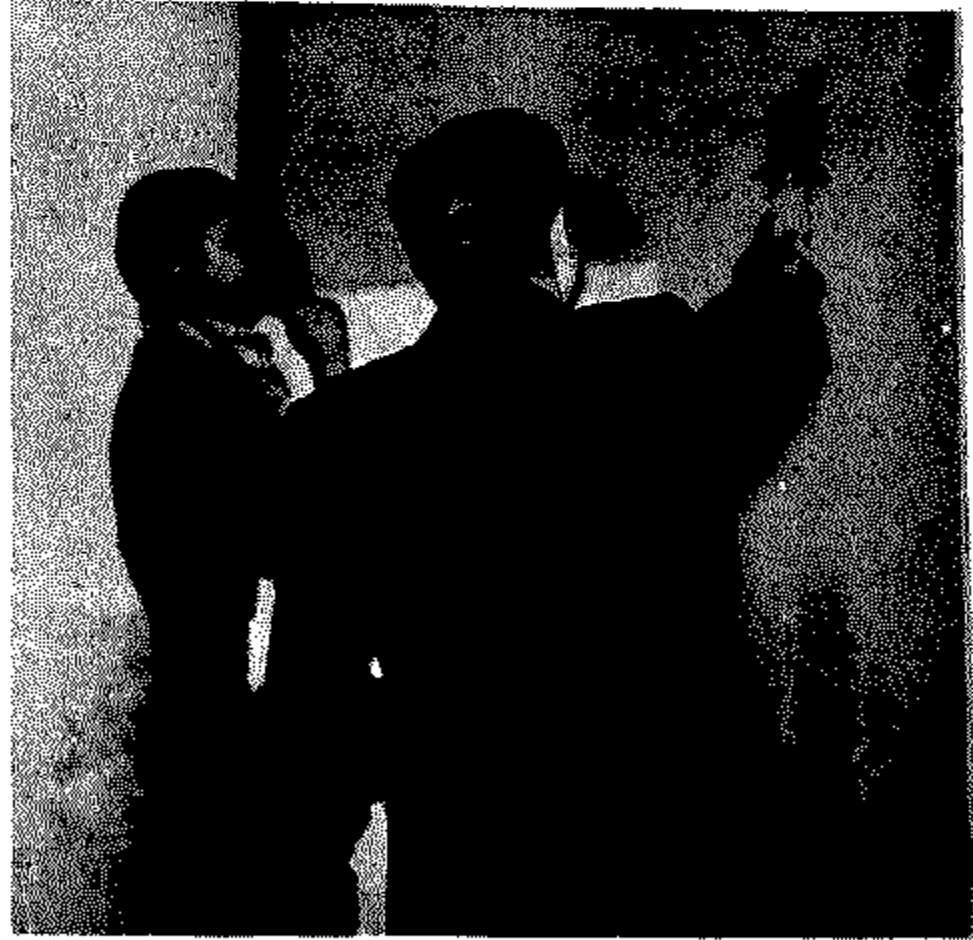
فاق سے اُسی دن تصویری نمائش کے ڈائرکٹر
ہال تشریف لے آئے اور دیوار والے نشانات کی بڑی تعریف کرنے لگے،
یم کے چچا محبوب صاحب خود بھی بڑے حیران تھے!

پھر اُسی دن ڈائرکٹر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ نشانات وسیم نے
بنائے ہیں تو انہوں نے اُسے ماڈرن آرٹ کا شاہ کار کہا اور ماڈرن آرٹ کا پہلا
انعام وسیم کو دے دیا ●●

حکومت آسٹریلیا کے شکریہ کے ساتھ

اُوپر ایک تصویر شائع کی جا رہی ہے، مگر یہ کیا ——؟ اس میں بات چیت تو دکھائی نہیں گئی ہاں بھئی یہ تصویری کارٹون ہے، اس میں بات چیت تمہیں بھرنی ہوگی اور اس پر انعام ملے گا۔ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر نیچے لکھے ہوئے پتے پر بھیج دو۔ جو جواب سب سے دلچسپ اور مزاحیہ ہوگا، اس کے بھیجنے والے کو دس دلچسپ کتابیں انعام دی جائیں گی۔

تصویری کارٹون نمبر ۵۵، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ ۲۲، فروری ۱۹۷۱
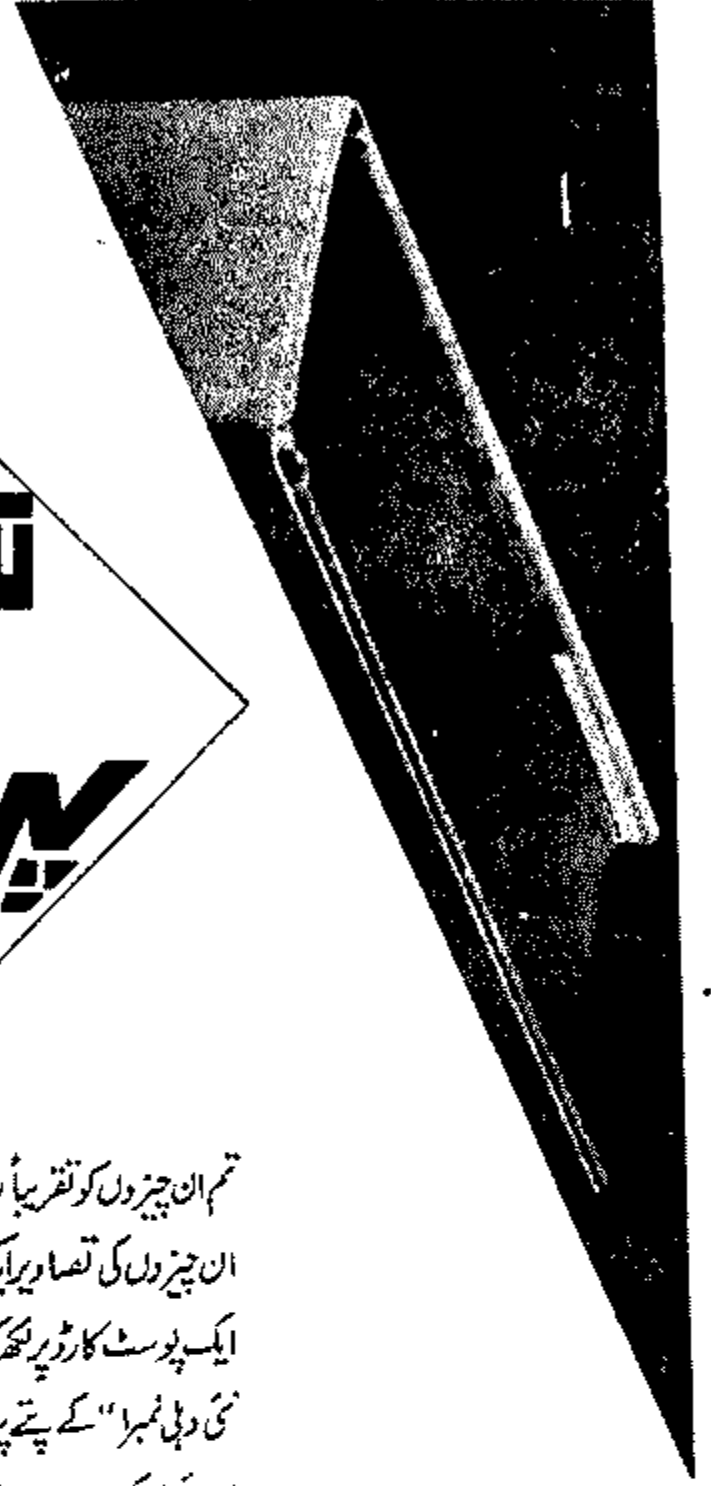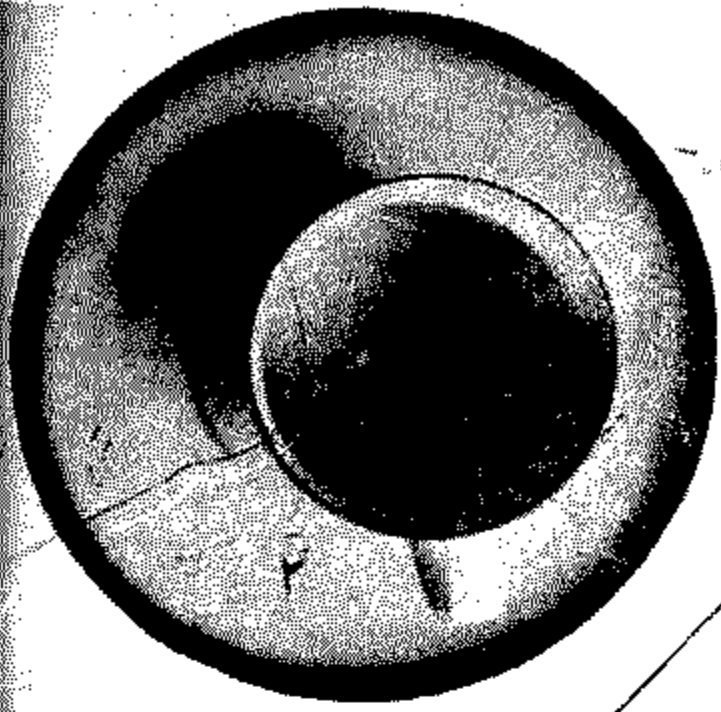
تصویری پہیلیاں

تم ان چیزوں کو تقریباً روز ہی دیکھتے اور استعمال کرتے ہو لیکن ہمارے فوٹوگرافر نے ان چیزوں کی تصاویر ایک عجیب زاویے سے لی ہیں۔ تم انہیں غور سے دیکھو اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر "تصویری پہیلیاں نمبر ۲۵، ماہنامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر۱" کے پتے پر بھیج دو۔ ۲۸ فروری ۱۹۷۱ تک صحیح جواب بھیجنے والے دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔
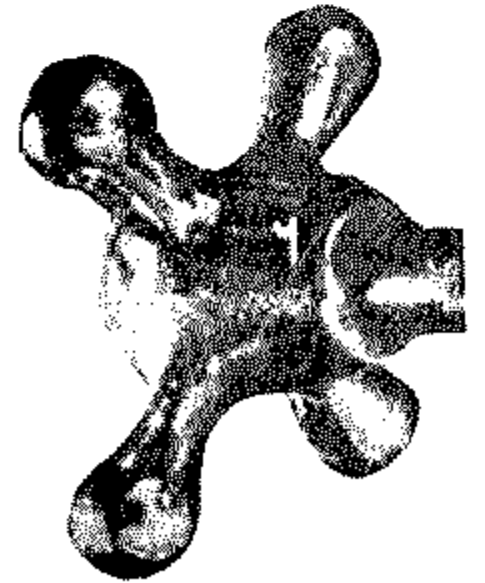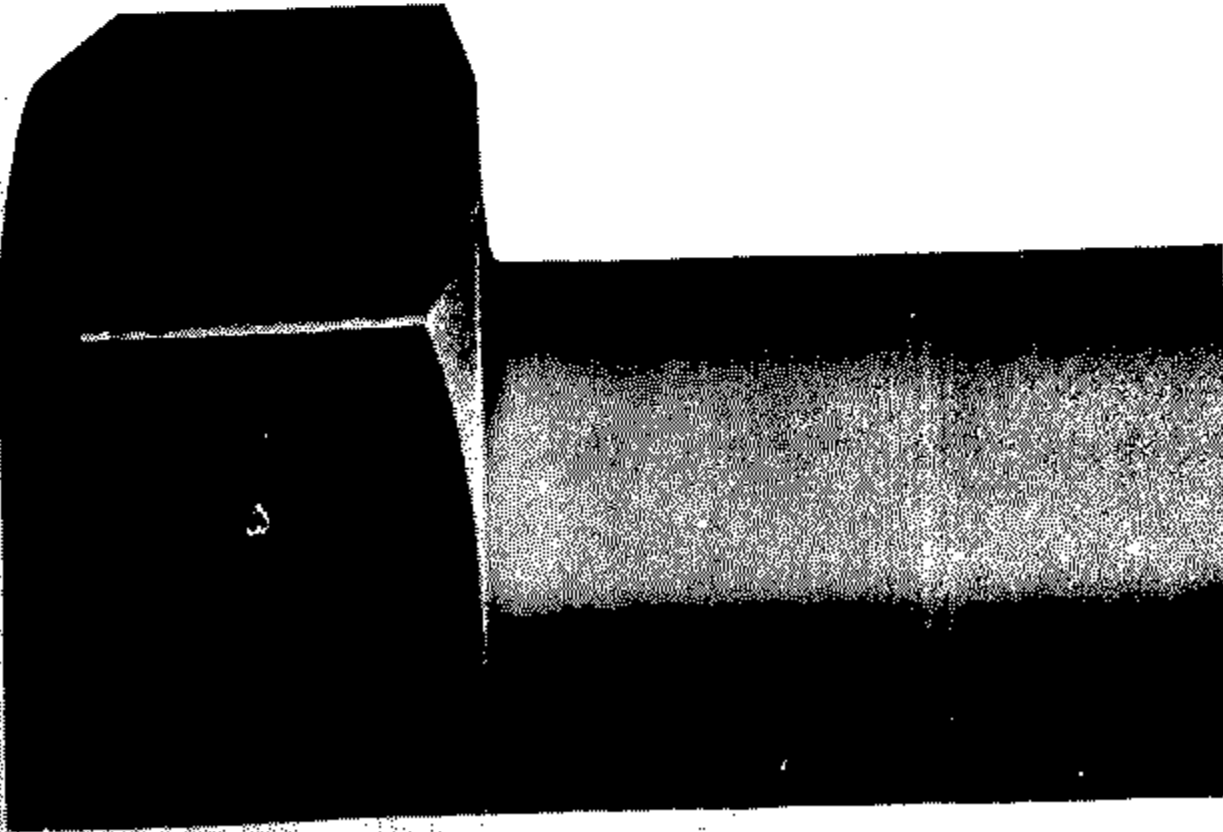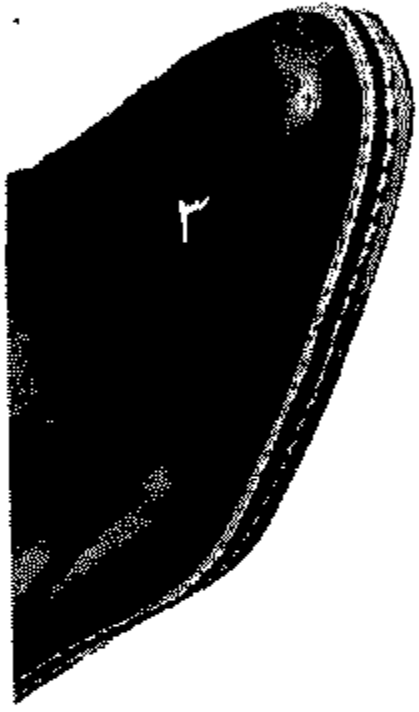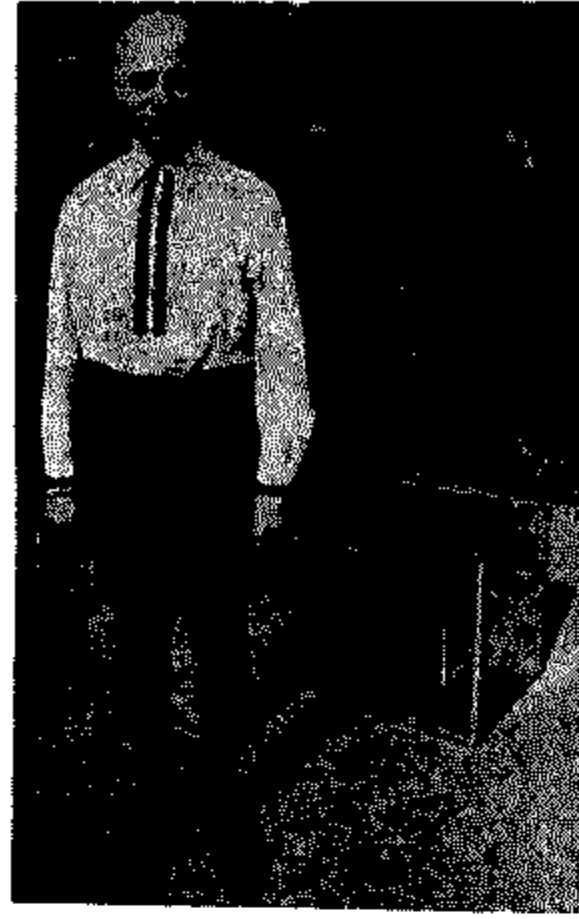
مارِس ڈیل مونٹے سچ مچ ربڑ کا بنا ہوا نہیں ہے، مگر لچکیلا وہ بے حد ہے۔ اسی لئے تو وہ سکڑ سمٹ کر بڑے مزے سے ٹین کے ایک ایسے بکس میں ہر رات کو بند ہو جاتا ہے جو صرف ½۱۹ انچ لمبا اور اتنا ہی چوڑا اور اونچا ہے۔ ہر رات کو وہ ہالینڈ کے نائٹ کلبوں میں اپنا یہ کرتب دکھاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو ڈبے میں بند کر چکتا ہے تو اُس کی بیوی اس ڈبے کو پالتو مچھلیوں کے ایک بڑے، چوکور مرتبان میں رکھ دیتی ہے۔ مارِس مرتبان میں اس طرح بغیر سانس لئے سات منٹ تک رہ سکتا ہے۔

مارِس کے جسم کا لچکیلا پن پیدائشی نہیں ہے۔ اس کرتب کے لئے اس کو کُل ملا کر کوئی ۲،۰۰۰ گھنٹے مشق کرنی پڑی ہے۔

شیر اور انسان کی دوستی

سلامت علی مہدی

یہ ایک ببر شیر اور ایک انسان کی دوستی کی کہانی ہے۔

دس سال تک وہ سرکس دیکھنے والوں کے لئے ایک تماشہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ جنگل کا بادشاہ تھا لیکن آج کل وہ سرکس کا بادشاہ بنا ہوا تھا اور اسی لئے اُسے سیزر کا نام دیا گیا تھا —— سیزر —— جو کبھی روم کا شہنشاہ تھا۔

گوٹکا سیزر، اُس کا تربیت دہندہ تھا۔ سیزر اور گوٹکا میں دس سال سے بے پناہ دوستی تھی۔ انسان اور ببر شیر کی اس دوستی پر ہر شخص حیران تھا۔ سرکس میں جب تماشہ کے دوران گوٹکا اپنا سر سیزر کے مونہہ میں رکھ دیتا تو تماشائی دنگ رہ جاتے، پورا سرکس تالیوں سے گونج اُٹھتا۔

لیکن دس سال بعد چونکہ سیزر بے حد بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس لئے سرکس کے مالک نے اُسے ریٹائر کردیا اور اس کا دوست گوٹکا اُسے اپنے مکان لے آیا۔ اب سیزر اپنے دوست کے مکان میں ایک بلی کی طرح گھومتا رہتا۔ گوٹکا اور وہ دونوں ساتھ کھانا کھاتے، باغ میں ایک ساتھ گھومتے اور صرف رات کو ہی ایک دوسرے سے جدا ہوتے۔

'سیزر' جب سے اپنے انسان دوست کے مکان آیا تھا اس مکان میں ایک زندگی سی پیدا ہوگئی تھی لیکن اس کے برعکس مکان کے تمام پڑوسیوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ وہ اکثر گوٹنکا سے کہتے "ببر شیر ہر حال میں درندہ ہوتا ہے، اس کا اس مکان میں رہنا خطرناک ہے اس لئے اُسے کھلا نہ چھوڑو بلکہ اسے پنجرے میں بند رکھا کرو۔" جواب میں گوٹنکا کہتا "نہیں وہ دس سال سے میرا دوست ہے اور میں ایک دوست کو اپنا قیدی نہیں بنا سکتا۔ میں اس کو بارہا آزما چکا ہوں۔"

گوٹنکا کے ہمسائے اس کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے چنانچہ انہوں نے مقامی حکّام سے شکایت کی۔ حکّام نے گوٹنکا کو بلایا اور اس سے کہا "مسٹر گوٹنکا ــــ یا تو تم اپنے سیزر کو 'zoo' بھیج دو اور یا یہ ثابت کرو کہ وہ بالکل بے ضرر ہے۔"

اور گوٹنکا نے حکّام کا یہ چیلنج منظور کر لیا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ حکّام کا چیلنج منظور کر لیا۔ سیزر بے ضرر ہے۔ اس کے امتحان کی تاریخ مقرر کر دی گئی اور پورا قصبہ جس میں مجسٹریٹ اور پولیس افسران بھی تھے انسان اور درندے کی دوستی کا یہ مظاہرہ دیکھنے کے لئے جمع ہوگیا۔

وقت مقررہ پر ۴۸ سالہ گوٹنکا میدان میں داخل ہوگیا جہاں اس کا دوست 'سیزر' پہلے سے موجود تھا، اس نے پہلے اپنے دوست سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی

پیٹھ تھپتھپائی۔ ببر شیر خاموش رہا۔

اب گوٹکا نے اس پر گھوڑے کی طرح سواری کی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا مونہہ بند کردیا ـــــ شیر اب بھی خاموش رہا۔ گوٹکا نے اس کے بعد میدان کے چاروں طرف موجود لوگوں سے کہا "غالباً اب آپ کو یقین ہوگیا ہوگا کہ میرا دوست درندہ ہونے کے باوجود بالکل بے ضرر ہے۔"

لیکن ـــــ

ابھی گوٹکا کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ سیزر دہاڑا اور بالکل اچانک اس نے اپنے دس سالہ پرانے دوست کو اچھال دیا۔ گوٹکا زمین پر گرا تو وہ اس پر جھپٹ پڑا اور دونوں میں زندگی اور موت کی جنگ شروع ہوگئی۔

گوٹکا بالکل نہتا تھا۔

عورتیں چیخنے لگیں۔ پولیس نے بندوقیں تان لیں اور ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا۔

دو منٹ تک گوٹکا اور سیزر ایک دوسرے سے لڑتے رہے، گوٹکا کا بازو زخمی ہوگیا، قریب تھا کہ سیزر اس کی گردن میں اپنے دانت پیوست کردیتا کہ گوٹکا چیخا "میرے دوست کو گولی ماردو" اور ایک کانسٹبل نے سیزر کو گولی ماردی، سیزر ایک چیخ مار کر اُچھلا اور ڈھیر ہوگیا۔

بے ہوش گوٹکا کو ہسپتال میں داخل کردیا گیا ـــــ جب اس کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس نے اپنے دوست کے بارے میں ہی پوچھا اس نے سوال کیا "پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے میرے دوست کو کس طرح دفن کیا۔"

گوٹکا اس کے بعد اپنے دس سالہ دوست کی موت پر رونے لگا۔

انعامی تصویر

تصویر : صدیقی

تم "کھلونا" میں ہر ماہ انعامی تصویر دیکھتے ہو۔ اس تصویر کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ اصل میں اس کا عنوان تم کو لکھنا ہے تم اس کا کوئی خوب صورت سا دلچسپ عنوان سوچو اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر نیچے لکھے ہوئے پتے پر ہمیں بھیج دو۔ جس کھلونا بہن بھائی کا عنوان سب سے اچھا اور دلچسپ ہوگا اُسے دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی، پسند آنے والے اور بھی بہت سے عنوانات شائع کئے جائیں گے۔

انعامی تصویر نمبر ۵۳، ماہ نامہ کھلونا، آصف علی روڈ، نئی دہلی

ہمیں جواب ملنے کی آخری تاریخ: ۲۲. فروری ۱۹۷۱

میرا کھلونا

سب سے اچھا میرا کھلونا
ہے تو کھلونا یہ کاغذ کا
شمع کے دفتر سے ہے چھپتا
لیکن کتنا معلوماتی
بچپن کے دن رات کا ساتھی
سب سے اچھا میرا کھلونا

ہاتھ سے چھوٹے ڈر نہیں اس کا
ٹوٹے پھوٹے ڈر نہیں اس کا
سنئے لطیفے اس کی زبانی
پیاری پیاری اس کی کہانی
سب سے اچھا میرا کھلونا

سارے جہاں کی بات سنائے
"چاند نگر" کی سیر کرائے
ایسے لطیفے ہم کو سنائے
رونے والوں کو بھی ہنسائے
سب سے اچھا میرا کھلونا

بچوں کا چھوٹا سا رسالہ
بوڑھوں کو بھی ہنسانے والا
چھوٹے بڑوں کے دل کو لبھائے
اچھی اچھی بات سکھائے
سب سے اچھا میرا کھلونا

بات بتائے دانائی کی
شمع دکھائے سچائی کی
پریم پیار کی بزم سجائے
مل جل کر رہنا سکھلائے
سب سے اچھا میرا کھلونا

شمیم کرہانی

گولیوں کا مذاق

”نہیں — سپاہی تو کوئی نظر نہیں پڑا۔
کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں ؟

یقیناً — جو کچھ مال ہے، نکال دیجئے“

”افسوس ہے میں ایسے وقت
”تنخواہ بڑھانے کو“
کہنے کے لئے پہنچا جب
وہ مسلسل گھاٹے کی
وجہ سے خودکشی کرنے والے
تھے۔“

”بھائی، آخری لمحے پر مجھے خیال آیا کہ
خودکشی حرام ہے۔“

”بدنصیبی میں پستول کی گولی بھی ساتھ نہیں دیتی اور ایک کان سے
دوسرے کان میں ہو کر نکل جاتی ہے۔“
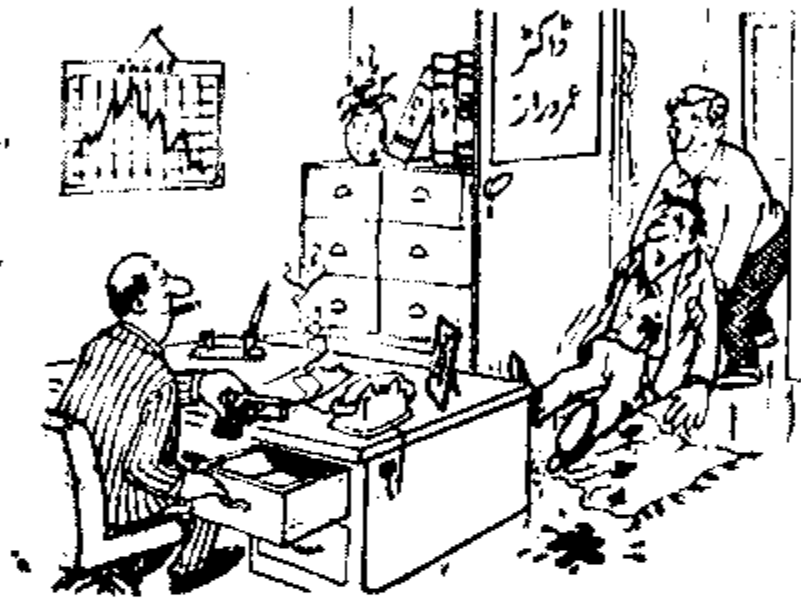
”عوام بے حد سنسنی خیز ڈرامے کی مانگ کر رہے تھے!“

غلام احمد فرقت

کہاوتوں کی کہانی

ہم روزمرّہ اپنی آپس کی بول چال میں ایسی کہاوتیں اور محاورے بولتے ہیں جن کا مطلب تو ہم سمجھ لیتے ہیں مگر ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کہاوتیں اور محاورے کس طرح ہماری زبان میں آئے اور ہم اُنہیں کب سے بولتے چلے آرہے ہیں۔ تم کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اِن محاروں اور کہاوتوں میں بعض ایسے ہیں جن کے پیچھے بڑے دل چسپ لطیفے اور قصّے چھپے ہوئے ہیں۔

ہم اپنی روزمرّہ کی گفتگو میں "وہی مُرغ کی ایک ٹانگ" بولتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی بس اپنی ہی بات پر اَڑا رہے۔ چاہے حقیقت اس کے خلاف ہو۔ اس مقولے کے پیچھے جو قصّہ چھپا ہے وہ بڑا دل چسپ ہے۔

ایک انگریز کے یہاں ایک خانساماں نے ایک مُسَلّم مُرغ پکا کر اس کی ایک ٹانگ خود کھالی اور ایک اپنے صاحب کے سامنے کھانے کی میز پر رکھ دی۔ صاحب نے ایک ٹانگ دیکھ کر کہا۔

"ول خانساماں! اس مُرغ کی ایک ٹانگ کہاں ہے۔؟"

خانساماں نے جواب دیا: "حضور! اس مُرغ کی ایک ہی ٹانگ تھی۔"

اس پر صاحب کو ہنسی تو آئی مگر وہ خاموش ہوکر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ برآمدے کے سامنے کچھ مُرغ اور

شکاری کا شکار

مُرغیاں دانا چُگ رہی تھیں۔ اُن میں ایک مُرغ اپنا ایک پاؤں سمیٹے دوسرے پاؤں سے کھڑا تھا۔ خانساماں کو اچھا موقع مِلا۔ اُس نے کہا، دیکھئے صاحب یہ مُرغ بھی ایک ہی ٹانگ کا ہے۔"

یہ سُن کر صاحب مُرغ کے پاس گئے اور انھوں نے "ہُش ہُش کیا" مُرغ نے دوسری ٹانگ بھی نکال دی۔ خانساماں نے یہ دیکھ کر کہا "حضور! کھانا کھاتے وقت سرکار سے بڑی چُوک ہوگئی۔ اگر آپ اس پکے ہوئے مُرغ کے سامنے بھی اسی طرح "ہُش ہُش" کرتے تو وہ بھی اپنی دوسری ٹانگ نکال لیتا۔"

"اُس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل بن گیا۔"

اسی طرح ایک دوسری مثل ہے جو ہم اپنی روز مرہ کی گفتگو میں بولتے ہیں۔ یعنی 'پنچ کہیں بلّی تو بلّی' اس سے متعلق بھی ایک بڑا دلچسپ قصہ مشہور ہے۔

ایک منہار اپنی دُکان میں کُنڈی لگا کر دُکان کے سامنے ایک چارپائی بچھا کر سونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوئی جب وہ کچی نیند ہی میں تھا تو ایک چور کُنڈی کھول کر دُکان میں گھس گیا۔ بنیئے نے جب دُکان کھلنے کی کھٹ پٹ سُنی تو جھٹ اُٹھ کر دُکان کے دروازے کھینچ کر دُکان میں قفل لگا دیا۔ چور نے جب یہ دیکھا تو "میاؤں میاؤں بولنے لگا۔ اس وقت بنیئے نے کہا، "بھیا جی صبر کرو! صبح ہونے دو۔ دِن ہونے پر ہم سب پنچوں کو بُلائیں گے۔ اگر پنچ بلّی کہیں گے تو بلّی۔" چناں چہ یہ مقولہ اس وقت سے زبان زد ہوگیا۔

اسی طرح ایک اور مثل ہے کہ ٹکے کی نہاری ٹاٹ کا ٹکڑا۔ اس سے متعلق بھی ایک بڑا دلچسپ لطیفہ ہے۔ ایک شخص نے اپنے نوکر سے آٹھ آنے کی نہاری منگائی اتفاق سے اُس میں سے زربفت کا ایک ٹکڑا نکلا۔ اس شخص کے پاس اس کا ایک لالچی دوست بیٹھا تھا۔ اُس نے جو یہ ماجرا دیکھا تو اس کے مونھ میں پانی بھر آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے فوراً اپنے نوکر کو حکم دیا کہ بازار سے دو پیسے کی نہاری لے آئے۔ اتفاق سے اس بار نہاری میں سے ایک ٹاٹ کا ٹکڑا نکلا۔ یہ دیکھ کر جب لالچی نوکر پر بگڑنے لگا تو نوکر نے ہاتھ جوڑ کر کہا، "سرکار ٹکے کی نہاری میں ٹاٹ کا ٹکڑا نہیں نکلے گا تو کیا سونے چاندی کی سلیں نکلیں گی؟" اس وقت سے یہ مقولہ سب کی زبانوں پر چڑھ گیا۔ اس کو اس وقت بولتے ہیں جب یہ کہنا ہوتا ہے کہ سستی چیز میں کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہوتا ہے۔

ایک اور مثل ہے: "اُونٹ کس کل بیٹھتا ہے؟" اس کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے کیا ظہور میں آتا ہے اور کیا انجام ہوتا ہے۔ اس سے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک کمہار اور ایک سبزی فروش نے مِل کر ایک اُونٹ کرائے پر کیا اور اس کے ایک ایک طرف اپنا سامان لاد دیا۔ رستے میں سبزی بیچنے والے کی ترکاری کو اونٹ گردن موڑ موڑ کر کھانے لگا۔ یہ دیکھ کر کمہار مسکراتا رہا۔ جب اونٹ منزل پر پہنچا تو جدھر کمہار کے برتنوں کا بوجھ تھا، اونٹ اسی کروٹ بیٹھا۔ چناں چہ بہت سے برتن ٹوٹ پھوٹ گئے۔ اس وقت

سبزی بیچنے والے نے کمہار سے ہنس کر کہا "کیوں گھبراتے ہو۔ دیکھو اب آئندہ اُونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔"

ہم اکثر کہتے ہیں کہ "حضور آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب بہت زیادہ انکساری ظاہر کرنی ہوتی ہے۔ اب اس مقولے سے متعلق جو لطیفہ ہے اُسے سن لیجئے۔ ایک مرتبہ ایک مسخرے کو دل لگی سوجھی جھٹ پٹ اُس نے چند دوستوں کی دعوت کر دی۔ جب وہ لوگ آکر بیٹھ گئے، تو اُس نے سب کے جوتے لے کر ایک شخص کے حوالے کئے جو پہلے ہی سے اس کے لئے مقرر تھا۔ وہ شخص سارے جوتے کباڑی بازار میں جا کر بیچ آیا۔ یہ رقم دعوت کے کھانے کی تیاری میں کام آئے۔ جب دستر خوان پر کھانا چنا گیا تو سب مہمانوں سے مسخرے نے کہا کہ آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی۔ مسخرے نے نہایت عاجزی سے کہا "یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔" اس کے بعد جب سب لوگ کھانا کھانے کے بعد جوتے پہننے کے لئے اُٹھے تو جوتے ندارد تھے۔ اس پر مسخرے نے کہا "حضور! وہ تو میں آپ سے پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ یہ سب آپ ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔"

اب وہ چھوٹے چھوٹے مقولے اور سن لو۔ ایک مقولہ ہے: "اُونٹ کے گلے کی بلّی"، یہ مقولہ اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب انسان کسی مشکل میں پڑ جاتا ہے اور اُس سے نکلنے کی فکر کرتا ہے۔ چناں چہ مشہور ہے کہ ایک شخص کا اونٹ کھو گیا۔ آدمی بڑا پرہیز گار تھا۔ جب باوجود انتہائی تلاش کے اُونٹ نہ ملا تو اُس نے قسم کھائی اگر اُونٹ مل جائے گا تو وہ اُسے ٹکے کا بیچ دے گا۔ اتفاق سے وہ اُونٹ مل گیا۔ اس وقت یہ شخص گھبرا گیا کہ اب تو بہر حال اُونٹ کو ایک ٹکے میں بیچنا پڑے گا۔ یہ دیکھ کر ایک آدمی نے اس کو یہ صلاح دی "تم اس کے گلے میں ایک بلّی باندھ دو، اور اس طرح آواز لگاؤ کہ ایک ٹکے کا اونٹ ہے اور سو روپے کی بلّی۔ لیکن یہ دونوں ایک ساتھ بکیں گے۔" اُس شخص نے ایسا ہی کیا، جس کے بعد اس کو مصیبت سے نجات ملی۔

ایک اور کہاوت ہے، "آپ سے آئے تو آنے دو"، یہ الفاظ ہم روز بولتے ہیں مگر اس فقرے کے پیچھے بھی ایک بے حد دل چسپ لطیفہ چھپا ہوا ہے۔ یہ مثل اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی شخص مفت کا مال کسی حالت میں نہ چھوڑنا چاہے۔ مشہور ہے کہ کسی قاضی کے گھر میں پڑوس کی ایک مرغی چلی آئی۔ گھر والوں نے اُسے پکا کر دستر خوان پر قاضی صاحب کے سامنے رکھا اور انہیں بتا دیا کہ یہ پڑوس کی مرغی تھی۔ قاضی صاحب بہت بگڑے۔ مگر پھر سوچنے لگے کہ کسی ترکیب سے اسے جائز قرار دیا جائے۔ چناں چہ بولے "اچھا سنو! اب تو جو گناہ ہونا تھا وہ ہوا ہی مگر اسے پھینکنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اگر اسے پھنکوا دیا جائے تو اس میں جو میرے گھر کا مسالہ لگا ہے وہ ضائع ہو جائے گا لہٰذا میں صرف اس کے شوربے سے روٹی کھا لوں گا۔ اور بوٹی کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔" جب لونڈی نے پیالے میں شوربا انڈیلا تو اس میں بوٹیاں بھی آنے لگیں۔ لونڈی نے ہاتھ روکنے کی کوشش کی تو قاضی صاحب بولے۔

"ارے! تو ہاتھ کیوں روکتی ہے؟ اگر بوٹی آپ سے آتی ہے تو آنے دے۔"

اس پر قاضی جی کی بیوی نے کہا مرغی بھی تو آپ سے آئی تھی۔ قاضی جی بولے "تم کو معلوم نہیں جو آپ سے آئے وہ جائز ہے۔"

●●

مرغا مرغی

نیاز حیدر

نئے سال کا مُرغا بولا
نئے سال کی مُرغی سے
نئے سال میں اپنا ڈربہ روشن ہوگا بجلی سے
چُگنے کو اچھے خاصے دانے ڈُنکے پِل جائیں گے
موتی مُونگے ہیرے پنّے آخر کس کام آئیں گے
نئے سال میں گلا کٹانے کو پائیں گے نئی چُھری
اپنے پالنے والے مالک لے آئیں گے نئی چُھری
مُرغی بولی پھر تو یہ سب گُھڑکن گُوں تیری بے کار
تُو ہے لڑائی کا ہیرو پھر کیوں مانے ہے اپنی ہار
میں چکّر دے سکتی ہوں تندوری کھانے والوں کو
مُرغا مُرغی کھا کر اپنی شان جتانے والوں کو
میں اب یہ پرچار کروں گی
اے انسانو
میرے مہذّب حیوانو
تم سب مِل کر ایک پولٹری فارم بناؤ
میں بے گِنتی انڈے دے سکتی ہوں
اصلی سونے کا انڈا بھی
انڈا انسانوں کو
ایٹم بم سے بچانے کا ضامن ہے
مُرغا بولا
نئے سال میں تیری عقل کُڑک ہوگئی کیا؟

بانو کشیدہ کاری

نئے فیشن کی ضرورتوں کے عین مطابق
بی بانو کشیدہ کاری ترتیب دی گئی
ہے جو آج تک پیش کی جانے والی
کشیدہ کاری کی کتابوں میں سب سے زیادہ
ممتاز مقام حاصل کر رہی ہے۔
اُردو ہندی میں۔ قیمت : سات روپے

فرح کشیدہ کاری

جدید دَور کی تبدیلیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرح کشیدہ کاری
کو ترتیب دیا گیا ہے جس میں ساڑیوں اور دوپٹوں کے دل کش
ڈیزائن، لاجواب بیلیں، قمیض کے گلے، بچوں کے کپڑوں کے
ڈیزائن اور سلمے ستارے کا کام بالکل نئے انداز سے دیا گیا ہے۔
اُردو ہندی میں۔ قیمت : آٹھ روپے

زینت کشیدہ کاری

بیگم زینت کوثر کی ترتیب دی ہوئی
کشیدہ کاری جس میں دل پسند نمونے
پیش کیے گئے ہیں۔ کئی طریقوں سے
کاڑھنے کے علاوہ رنگوں کے انتخاب کے
اصول اور مختلف ٹانکوں کا استعمال بڑی وضاحت
سے سمجھایا گیا ہے۔ اُردو ہندی میں قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

شمع کشیدہ کاری

جس میں پکچوگرام، تکیے کے اشعار، سلمے ستارے، جمپر اور
قمیضوں کے گریبان، کُرتوں کی بیلیں، تکیے کے غلاف اور مُرتوں
کے لئے حسین بُوٹیاں اور شلوار کی مُہریوں کی بیلیں، ساڑیوں
اور دوپٹوں کے لئے بُوٹے اور دیدہ زیب بیلیں۔ اُردو اور ہندی میں
قیمت : ۴ روپے ۵۰ پیسے

بہترین کشیدہ کاریاں

ناشر بک ڈپو۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی

رشیدہ کی کشیدہ کاری

کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن، لاجواب بیلیں، لراس اسٹچ، کٹ
ورک، مرتیوں کا کام، مونوگرام، سینریاں، تکیے کے اشعار اور ڈیزائن
پٹی کوٹ کے بارڈر، قمیضوں کے گلے، کٹ ورک، اسموکنگ،
لیزی ڈیزی، اس کی مدد سے نوآموز بہنیں بڑی آسانی سے بنا سکتی
ہیں۔ اردو اور ہندی میں ـــــ قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

حسین کشیدہ کاری

کشیدہ کاری کی ایک ایسی
لاجواب کتاب
جس میں
جدید وقدیم ہر قسم کے
ڈیزائن
موجود ہیں
قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

زینت کروشیا ڈیزائن بک

بیگم زینت کوثر کی ترتیب دی ہوئی اور نولو آفسیٹ کے
طریقے پر چھاپی گئی کروشیا ڈیزائن سے متعلق ایک ایسی
لاجواب کتاب جس میں ہر قسم کے دل پسند نمونے پیش
کیے گئے ہیں۔
قیمت : ۵ روپے

دُلہن کشیدہ کاری

دُلہن کی طرح
سجی ہوئی اور دیدہ زیب
کشیدہ کاری
جس کے بہترین نمونے
آپ کا
دِل لبھائیں گے
قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

قدسیہ کشیدہ کاری

کشیدہ کاری کے عمدہ اور نئے نئے ڈیزائن حاصل کرنے
کے لئے یہ کشیدہ کاری ضرور طلب کریں۔
قیمت : ایک روپیہ

کامیاب درزی خانہ

درزی خانے سے متعلق مکمل اور
جامع کتاب
ہر قسم کے کپڑوں کی تراش سمجھائی
گئی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے
بہترین ڈیزائن کے کپڑے گھر بیٹھے
تیار کیے جا سکتے ہیں۔ قیمت : ۲ روپے

شبنم کشیدہ کاری

کشیدہ کاری سے متعلق ایک ایسی کتاب جس میں ہر طرز
کے ڈیزائن موجود ہیں
قیمت : ایک روپیہ

اختر علی

دل چسپ کاشت کاری

لفظ کاشت کاری کے ساتھ ہی ذہن کے پردے پر کھیت میں ہل چلاتے ہوئے کاشت کار کی تصویر ابھر آتی ہے ـــــ وہ کاشت کار جو ہمارے اور آپ کے لئے تپتے ہوئے جون، ٹھٹھرتے ہوئے دسمبر اور بھیگتے ہوئے اگست میں زمین سے سونا اگانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے اِس طریقے سے تو آپ سب واقف ہی ہیں۔ آیئے میں آپ کو کچھ عجیب و غریب کاشت کاری کے متعلق بتاؤں

موتی کی کاشت کاری :

دھنک کے سات رنگوں میں لپٹا ہوا، گول دودھ کے مانند سفید موتی کتنا دل کش اور خوب صورت ہوتا ہے ـــ موتی کی قیمت اس کے وزن پر منحصر ہوتی ہے لیکن اس کے

میں نے گولی پہلے چلادی تھی اور پستول
بعد میں نکالا تھا

ساتھ رنگ اور شکل بھی موتی کی قیمت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں
موتی سفید ہی نہیں، کالے بھی ہوتے ہیں۔ کم یاب ہونے کی
وجہ سے ان کی قیمت سفید موتیوں کے مقابلے زیادہ ہوتی
ہے ــــ موتی کی پیدائش سیپ سے ہوتی ہے۔ سیپ تو آپ
سب نے دیکھی ہوگی۔ یہ بغیر ریڑھ کی ہڈی کا کیڑا ہوتا ہے
جو ندی اور سمندر میں پایا جاتا ہے۔ اس کا جسم بہت نازک
ہوتا ہے اس لئے قدرت نے اس کے جسم کی حفاظت کے
لئے اس کو چونے کے مرکب سے بنا ہوا خول عطا کیا ہے
جو اس کے جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ سیپ کے بیرونی تشابہ
سے یہ شناخت کرنا کہ کس سیپ میں موتی ہے اور کس میں
نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے موتی پانے کے لئے ہر بند
سیپ کے منہ میں جھانکنا پڑتا ہے۔

سیپ میں موتی بننے کا کیمیاوی عمل بھی دلچسپی سے
خالی نہیں۔ جب کبھی کوئی سیپ پانی، ہوا اور خوراک کے
لئے اپنے محل کے دونوں دروازے کھولتی ہے۔ اگر اس دوران
میں کوئی چھوٹا کیڑا مکوڑا یا ریت کا ذرہ اس کے اندر داخل
ہو جاتا ہے تو سیپ گھبرا کر فوراً اپنے محل کے دروازے بند
کر لیتی ہے۔ سیپ اپنے محل میں آئے ہوئے اس بن بلائے
مہمان کی موجودگی برداشت نہیں کرتی لیکن مشکل یہ ہوتی ہے
کہ اسے باہر نکالنے کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ
نہیں ہوتا۔ ہاں، اپنے جسم کے اندر اسے جسم سے الگ رکھنے
کے لئے سیپ اپنے نازک جسم سے ایک رقیق مادہ پیدا کرتی
ہے جو اس ذرہ یا کیڑے کے چاروں طرف لپٹ جاتا ہے
اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک سیپ
کے جسم سے اس کا تعلق ختم نہیں ہو جاتا۔ جب کبھی کوئی
غوطہ خور کسی ایسی بند سیپ کے پٹ کھولتا ہے تو اس میں
خوب صورت جھلملاتا ہوا آنکھوں کے سامنے دھنک کے رنگ
بکھیرتا ہوا موتی نظر آتا ہے۔ یہ موتی حقیقتاً سیپ کا اپنے دشمن
کے لئے بنایا ہوا ایک مضبوط قید خانہ ہوتا ہے۔

موتی کی کاشت کا راز بھی یہی ہے اور یہ کام تیرہویں
صدی کے آس پاس پہلے مشرقی ملکوں میں شروع ہوا، لیکن
موتی کی کامیاب کاشت کا طریقہ سب سے پہلے جاپان کے
ایک نوجوان کوکومی کی موتی نے ۱۸۹۴ میں پیٹنٹ کرایا۔

موتی کی کاشت کے اس جاپانی طریقے میں کسی اچھی
سیپ کے چھوٹے سے ٹکڑے کو باریک ذرات میں تبدیل
کرلیا جاتا ہے۔ یہ موتی کے بیج کہلاتے ہیں۔ یہ بیج ایک
ایک کر کے ایک خاص قسم کے سیپوں میں جنہیں میلگرینا کہتے
ہیں رکھ کر ان کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور بعد میں ان
سب سیپوں کو چھچھلے سمندر میں کسی محفوظ مقام پر کچھ برسوں
کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سیپ اپنے اندر زبردستی
داخل کئے گئے ذرات کے گرد رقیق مادہ کا غلاف چڑھاتی
جاتی ہے، یہی بعد میں موتی کی شکل اختیار کرلیتا ہے ــــ
غوطہ خور کچھ برس کے بعد انہیں مخصوص سیپوں کو تلاش کرکے

اِن کے پَٹ کھول کر موتی نکال لیتے ہیں ۔

گھاس کی کاشت کاری :

ہمارے ملک میں دُوب گھاس کھیل کے لان بنانے یا جانوروں کو خوراک بہم پہنچانے کے کام آتی ہے۔ کچھ قسم کی گھاسوں سے کاغذ اور عطر بھی بنایا جاتا ہے۔ اگر ہم گیہوں دھان اور جَو کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ پُرانے زمانے میں گھاس ہی تھے، جنہیں انسان نے اپنی عقل سے اس قابل کرلیا ہے کہ آج وہی گھاس اِس کی خوراک کا اہم ذریعہ بن گئی ہے۔ گھاس کھانا آپ کے لئے شاید محاورہ ہی ہو، لیکن دنیا میں چند ملک ایسے بھی ہیں جہاں کچھ قسم کی گھاسیں بڑے شوق سے کھائی اور اُگائی جاتی ہیں اور وہاں کے باشندے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً گھاس کھاتے ہیں۔

آئرلینڈ میں لال سمندری گھاس کی کھیتی کرنے کے لئے اُتھلے پانی میں چپٹے پتھر رکھ دئے جاتے ہیں جس سے اُن پر سمندری گھاس کے بیج چپک جاتے ہیں۔ جب گھاس اُگ آتی ہے تو اُسے کاٹ لیا جاتا ہے اور دوسری فصل کے لئے پتھر کو اُلٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔

جاپان میں ہزاروں ایکڑ اُتھلے سمندر میں جھاڑیاں پھیلادی جاتی ہیں تاکہ لال سمندری گھاس اِن میں پھنس جائے یہ فصل جنوری سے مارچ تک کاٹ لی جاتی ہے۔

گھونگھوں کی کاشت کاری :

جاپان کا شمار کچھ ایسے ملکوں میں ہوتا ہے جہاں گھونگھوں کو مختلف طرح سے پکا کر بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ گھونگھوں میں وافر مقدار میں کاربوہائیڈریٹ، پروٹین
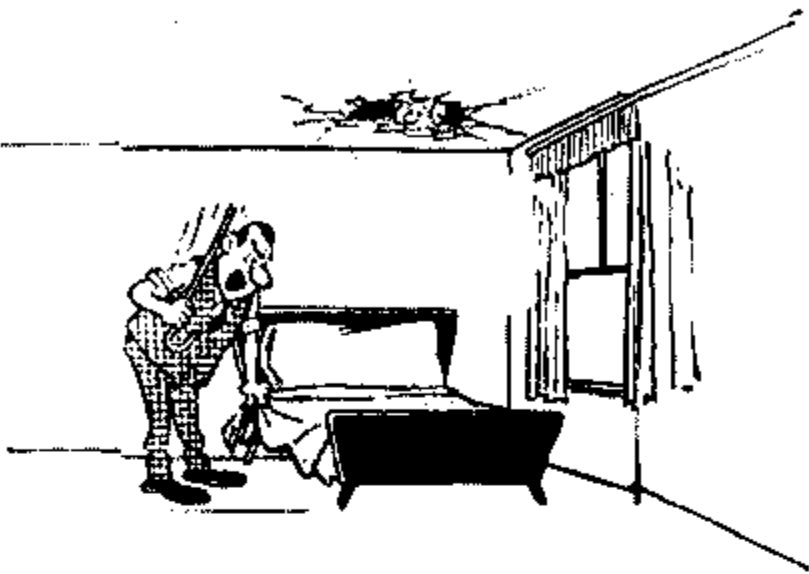
تم بستر پر اُچھل کیوں رہے ہو، جلدی نیچے سے نکلو

(لحم) گھاکوجن اور بہت سے حیات بخش نمکیات ہوتے ہیں۔

جاپان چھوٹے چھوٹے چٹانی ٹاپوؤں پر بسا ہوا ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں آبادی کے لحاظ سے جگہ بہت کم ہے۔ اپنی خوراک کے لئے جاپان کے باشندوں کو پچاس فی صدی حد تک سمندر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

سمندر میں گھونگھوں کی کاشت کے لئے جاپانی لوگ چھچلے سمندر میں چھلکے ڈال دیتے ہیں۔ پانی میں تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونگھوں کے بچّے اِن پر چپک جاتے ہیں بعد میں انہیں اُتھلی خلیج میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں رفتہ رفتہ وہ بڑے گھونگھوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں کی فصلوں کی طرح گھونگھوں کی فصل کی بھی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ کیوں کہ پانی میں اِن کے بہت دشمن ہوتے ہیں۔ گھونگھوں کا ذائقہ بہتر بنانے کے لئے انہیں مخصوص مقامات پر "بویا" جاتا ہے۔

اسفنج کی کاشت کاری :

آپ نے نہانے کے کام میں آنے والے اسفنج تو دیکھے

آئیے آپ کو پہنچا دوں؟ — نہیں شکریہ، میں ذرا جلدی میں ہوں

ہوں گے۔ یہ بھی ہماری اور آپ کی طرح جان دار ہوتے ہیں سائنس دانوں نے انہیں حیوانات کی جماعت میں رکھا ہے بیس ویں صدی سے پہلے اسفنج کو غیر جان دار چیز سمجھا جاتا تھا کچھ لوگ انہیں سمندری کیڑوں کے رہنے کا گھر سمجھتے تھے۔ لیکن بیس ویں صدی کے شروع میں ڈاکٹر رابرٹ گرانٹ نے ان کا جان دار ہونا ثابت کیا۔ اسفنج میٹھے اور کھاری دونوں قسم کے پانی میں پائے جاتے ہیں اور مختلف شکل کے ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ سفید، سرخی، پیلا، نارنجی، جامنی، ہرا بھورا نیلا اور کالا ہوتا ہے۔ اسفنج کو نہانے، فنِ مصوری اور صفائی وغیرہ کے بہت سارے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اسفنج کی کاشت چھچھلے سمندر میں کی جاتی ہے اس کے لئے کنکریٹ کے بڑے بڑے ٹکڑے سمندر کے اتھلے پانی میں ڈال دئے جاتے ہیں اور ان پر اسفنج کے ذرات چپکا دئے جاتے ہیں۔ جب پانی سے خوراک حاصل کرکے وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی فصل کاٹ لی جاتی ہے اور کنکریٹ کو اگلی فصل کے لئے تیار کر لیا جاتا ہے۔ اب ربر سے بھی مصنوعی اسفنج بنایا جانے لگا ہے۔ لیکن مصنوعی پھر مصنوعی ہوتا ہے، اس کا قدرتی اسفنج سے کوئی مقابلہ نہیں۔

بغیر مٹی کی کاشت :

جی ہاں۔ بغیر مٹی کی کھیتی! اور یہ سب سائنسی دور کا کرشمہ ہے۔ بغیر مٹی کی کاشت کا یہ طریقہ امریکہ اور برطانیہ میں تو کافی ترقی کر چکا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ابھی تجرباتی دور میں ہے۔
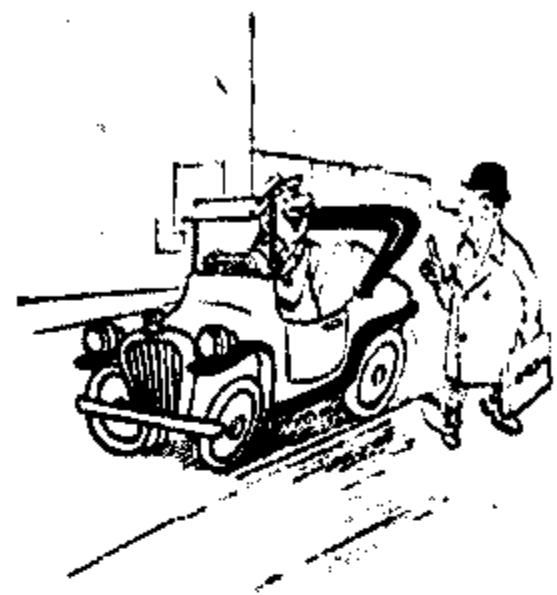
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس طریقے میں مٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پودے بالو یا پانی میں اگائے جاتے ہیں۔ پودے کی بڑھوتری کے لئے سورج کی کرنوں، ہرے مادّے کلوروفل اور مختلف قسم کے عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عناصر کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، فاسفورس، پوٹیشیم، کیلشیم، میگنیشیم، مینگنیز، بوران، جستا، گندھک، لوہا اور تانبا ہوتے ہیں۔ پودے کی جڑیں پانی جذب کرتی ہیں۔ جس سے انہیں ہائیڈروجن اور آکسیجن حاصل ہوتی ہے۔ پودے کی پتیوں میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے ہیں۔ جن سے وہ ہوا کی کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن لیتے ہیں، اس طرح انہیں کاربن اور آکسیجن عنصر حاصل ہوتے ہیں۔ باقی عناصر مختلف نمکیات کی شکل میں مٹی میں موجود رہتے ہیں۔ یہ نمکیات پانی میں گھل کر جڑوں کی مدد سے پودے کے جسم میں پہنچ جاتے ہیں۔ کلوروفل ہری پتیوں میں ہوتا ہی ہے۔ اب رہی مٹی کی اہمیت۔ تو وہ بس اتنی ہی ہے کہ اس کی وجہ سے پودے اپنی جگہ پہ قائم رہتے ہیں اور مٹی میں ملے ہوتے مختلف قسم کے حیات بخش نمکیات حاصل کرتے ہیں۔

پانی میں پودوں کو اگانے کے لئے پہلے صاف پانی میں ایسے نمکیات کے محلول تیار کرتے ہیں جس میں پودوں

کی بڑھوتری کے لئے ضروری عنصر شامل ہیں۔ یہ محلول مندرجہ ذیل طریقے سے تیار کئے جا سکتے ہیں۔

محلول نمبر ا شورا ۲ گرام۔ میگ سلف ۲ گرام، سوڈیم کلورائڈ ۵ گرام، کیلشیم سلف ۱ گرام، کیلشیم فاسفیٹ ۱ گرام، ہرکیس یا فرس سلفیٹ سو ملی گرام ۲۰ لیٹر پانی میں حل کریں۔

محلول نمبر ۲ شورا ۷ گرام، سوڈیم کلورائڈ ۸ گرام کیلشیم سلفیٹ ۲۵ گرام۔ فرک کلورائڈ ۰.۵ گرام، کیلشیم بائی فاسفیٹ ۲ گرام۔ دس لیٹر پانی میں حل کریں۔ پھر اس میں بورک ایسڈ محلول ۰.۶٪ ایک ملی لیٹر، میگنیشم کلورائڈ محلول ۰.۴٪ ایک ملی لیٹر شامل کریں۔

جن پودوں کو پانی میں اگانا مقصود ہوتا ہے پہلے کیاریوں میں ان کی پود تیار کرتے ہیں۔ پھر انہیں اس طرح کھودا جاتا ہے کہ ان کی جڑوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ جڑوں کو پہلے صاف پانی سے دھوتے ہیں تاکہ ان میں مٹی کے ذرات نہ رہیں۔ پھر انہیں کنوؤں میں ڈالی جانے والی لال دوا کے محلول سے دھوتے ہیں تاکہ ان کے جراثیم ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد انہیں پہلے سے تیار شدہ نمکیات کے محلول میں تار کی جالی کے سہارے اس طرح لٹکایا جاتا ہے کہ ان کی جڑیں محلول میں ڈوبی رہیں۔ چونکہ جڑوں کو ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کچھ وقفے سے محلول میں ہوا پھونکنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔
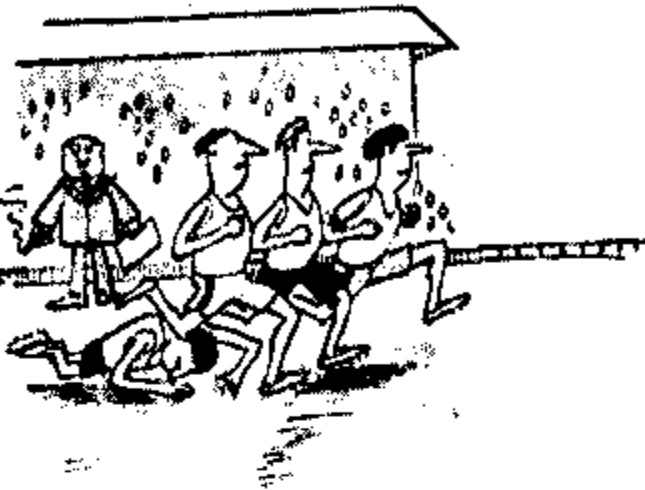
"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ دوڑ جو سے شروع نہ کراؤ، میں پستول چلانے میں اناڑی ہوں!"

پودے کی جڑیں جیسے جیسے محلول سے نمکیات جذب کرتی جاتی ہیں، ان کی کثافت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے محلول میں چھ سات یوم کے وقفے سے اور نمکیات شامل کردئے جاتے ہیں، تاکہ پودوں کو ان کی ضرورت کے مطابق نمکیات حاصل ہوتے رہیں۔

باغ بانی کا شوق رکھنے والے ایسے لوگ جو گنجان آبادی والے شہروں میں رہتے ہیں، جنہیں رہائش کے لئے کبھی کبھی صرف ایک تنگ کمرے پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ اور جہاں کچی مٹی کا دیدار صرف پارکوں میں ہوتا ہے۔ بغیر مٹی کے اس طریقہ کاشت سے اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

■■

شبراتن بُوا

عادل رشید

شبراتن بُوا نے اپنی زندگی کے پچاس سال قدیر میاں کی ڈیوڑھی پر خدمت گزاری کرتے کرتے گزار دیے تھے۔ جب وہ اس حویلی میں پہلی دفعہ داخل ہوئی تھیں تو ان کی عمر سات برس تھی وہ اس وقت سات برس کی ایک معصوم بچی تھیں اور اب وہ ستاون سال کی ایک ایسی بڑھیا تھیں جن کی کمر کسی قدر جھک گئی تھی، سر کے بال سفید ہو گئے تھے، چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں اور اب تو ان کی آنکھوں سے بھی کم سجھائی دینے لگا تھا۔ اور وہ تو بالکل ہی نہ دیکھ سکتیں اگر ان کے مالک قدیر میاں نے ان کی آنکھوں پر ایک چشمہ نہ چڑھوا دیا ہوتا۔

قدیر میاں شبراتن بوا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ انہیں بُوا کہتے تھے۔ قدیر میاں کی بیگم خالدہ بھی انہیں بوا ہی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اور قدیر میاں کے تینوں بچے بھی انہیں بوا ہی کہتے تھے۔ سارا گھر شبراتن بوا کی بڑی عزت کرتا تھا۔

شبراتن بُوا جب اس حویلی میں آئی تھیں تو قدیر میاں اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ شبراتن بوا کے آنے کے پورے چار برس بعد قدیر میاں پیدا ہوئے تھے۔ شبراتن بوا اس وقت

" . . . . اور جناب، ڈاکو کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کی پشت پر نہ مٹنے والی روشنائی سے "پارسل پوسٹ کی مہر" لگی ہوئی ہے۔"

گیارہ برس کی تھیں۔ ان ہی شبراتن بوا نے، جو اس وقت صرف شبراتن کہی جاتی تھیں، قدیر میاں کو گود میں کھلا کر ہوش و حواس کا کیا تھا۔

قدیر میاں اور ان کے بھائی بہن سب شبراتن کو شبراتن بوا کہتے تھے۔ اور پھر جب قدیر میاں کی شادی ہوگئی اور ان کی دلہن خالدہ اس گھر میں بیگم بن کر آئیں تو شبراتن بوا ہی نے انہیں ڈولے پر سے اُتار کر سجی سجائی مسند پر لے جا کر بٹھایا تھا۔

اب وہ زمانہ تھا کہ قدیر میاں ہی اس حویلی کے مالک تھے۔ ان کی بہن کی شادی ہو چکی تھی اور ان کا بھائی صغیر جو عمر میں ان سے چار سال چھوٹا تھا، لندن میں ڈاکٹر تھا اور وہیں جا کر بس گیا تھا۔

شبراتن بوا نے نہ جانے کیوں شادی نہیں کی تھی۔ وہ اس حویلی میں سب کی خدمت میں مگن تھیں۔ بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے لے کر اس عمر تک پہنچ جانے کے باوجود وہ دن دن بھر اور رات کے بارہ بارہ، ایک ایک بجے تک گھر کے کاموں میں لگی رہتی تھیں۔ زندگی اسی طور گزر رہی تھی کہ ایک دن بڑا ناخوش گوار واقعہ ہوا۔

" سرفراز میاں!" شبراتن بوا نے قدیر میاں کے منجھلے بیٹے سرفراز کو، جس کی عمر ابھی صرف چودہ برس تھی، بڑے پیار سے سمجھایا۔ " یہ بُری بات ہے میاں۔ تم اتنی رات گئے تک گھر سے باہر نہ رہا کرو۔"

"کیوں؟" سرفراز نے بڑی بدتمیزی سے کہا۔

" اس طرح اتنی رات گئے تک بچے باہر رہ کر بگڑ جاتے ہیں۔" شبراتن بوا بولیں۔

" بچے بگڑ جاتے ہیں؟" سرفراز نے اسی تیز لہجے میں کہا۔

شبراتن بوا پیار اور ملائمت سے سمجھانے کے طور پر بولیں، " ہاں میاں ———"

" تو تمہیں کیا؟ تمہارا بچہ تو کوئی ہے نہیں۔"

" ارے!" شبراتن بوا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

" تو کیا تم میرے بچے نہیں ہو؟"

" میں تمہارا بچہ ہوں؟"

" میں تو آج تک ایسا ہی سمجھتی آئی ہوں بیٹے۔"

" خبردار جو مجھے بیٹا وبیٹا کہا ——— کہے دے رہا ہوں ہاں ———" سرفراز نے اور زیادہ بدتمیزی کی۔ " خدا نہ کرے کہ میں نوکرانی کا بیٹا ہوں۔"

شبراتن بوا کا مونہہ فق ہوگیا۔ اُن کے کلیجے پر بڑے زور کا گھونسا پڑا۔ لیکن وہ سنبھل کر بولیں، " میں نوکرانی ہی میاں، لیکن . . . ."

" چُپ رہ، ذلیل بڑھیا!" سرفراز آگ بگولہ ہوگیا۔ " میں سمجھ گیا ہوں کہ تم اس طرح کی باتیں کر کے ابا جان کو یہ جتا دینا چاہتی ہو کہ میں راتوں کو دیر سے گھر آتا ہوں۔ تم ابا جان سے

مجھے پٹوانا چاہتی ہو۔"

"نہیں میرے لال، یہ بات نہیں۔ میں تو . . . ."

"اب چپ بھی رہے گی کہ نہیں؟"

"لیکن میاں . . . ."

"اس طرح نہیں مانے گی یہ بڑھیا۔"

اور یہ کہہ کر سرفراز نے شبراتن بوا کے جھرّیوں بھرے گال پر ایک بھرپور طمانچہ جڑ دیا۔ اور شبراتن بوا چکرا کر اسی جگہ گر پڑیں بے چاری۔

"خبیث بڑھیا!" سرفراز بڑے جھلائے ہوئے انداز میں برآمدے سے اندر کمرے ہی جا رہا تھا کہ اس کی ماں خالدہ کا ایک بھرپور طمانچہ اس کے گال پر پڑا۔ اور پھر وہ اسے دیوانہ وار پیٹنے لگی۔

"کمینے! گستاخ! بے ادب! نالائق!" وہ اسے بُرا بھلا کہہ کر دیوانہ وار پیٹتی جا رہی تھیں کہ شبراتن بوا دُہائیاں دیتی ہوئی آئیں۔

"نہیں نہیں دلہن بی بی، خدا کے لئے نہیں۔ جانے دیجئے۔"

اور پھر گھر کے اور لوگ بھی آ گئے۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" سرفراز کے ابّا جان قدیر میاں نے پوچھا۔ اور سرفراز کا دم بالکل ہی نکل گیا۔ اور جب قدیر میاں کو یہ ساری باتیں اپنی بیگم کی زبانی معلوم ہوئیں تو قدیر میاں نے سرفراز کو مارتے مارتے بے حال کر دیا۔

گھر کے سارے ممبر کمرے میں جمع تھے۔ سرفراز اپنا سر جھکائے بیٹھا تھا اور قدیر میاں ایک واقعہ سنا رہے تھے ——

"ایک لڑکے نے اپنے گھر کی ملازمہ کے لئے بدتمیزی کی تھی۔ اُس لڑکے کا باپ نہیں تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ صرف ماں تھی

. . . اور جناب، ڈاکو کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک پکی برانڈ سال بھر قایم رہنے والے پینٹ میں رنگا ہوا ہے

اور اس کی ماں نے جب یہ سُنا تو اس نے اپنے بیٹے کی اس بدتمیزی پر اُسے بہت مارا۔ اور مار پیٹ کر اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اور گھر سے باہر نکال کر اس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔"

قدیر میاں نے مونہہ بنایا۔

"اور یہ دسمبر کی ایک سرد ترین رات تھی۔"

"اس سردی میں ماں نے بیٹے کو گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا؟" اُن کی بیٹی نجمہ نے سردی میں ایک زور کی جھرجھری لی۔

"ہاں —— اسی طرح کا دسمبر کا مہینہ تھا بیٹی۔" قدیر میاں نے کہا "اور رات تھی۔ بہت زیادہ سردی پڑ رہی تھی۔"

"اتنی ہی زیادہ۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" قدیر میاں نے بتایا "اس لئے کہ یہ بمبئی ہے بیٹی، جہاں یو۔پی سے بہت ہی کم سردی پڑتی ہے۔ اور یہ واقعہ جو بالکل سچا ہے، یو۔پی کا ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں بیٹی ——" قدیر میاں نے اپنی بات جاری رکھی، "اور اس ماں نے اپنے بیٹے کی اس بدتمیزی پر اُسے صرف ایک لنگوٹی میں گھر سے باہر نکال کر گھر کی کنڈی بند کر دی تھی۔"

"صرف ایک لنگوٹی میں۔"

"ہاں بیٹی —— اور اس کے اس بیٹے کی عمر ان صاحب زادے سرفراز سے آدھی تھی۔"

"بڑی بے رحم تھی وہ ماں!" نجمہ کے مونہہ سے نکلا۔

"نہیں بیٹی۔" قدیر میاں نے کہا "وہ ماں بے رحم بالکل نہیں تھی۔ بلکہ وہ ایک آدرش قسم کی ماں تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی صحیح معنوں میں اصلاح کر رہی تھی۔ اسے ایک آدرش قسم کا بہت بڑا آدمی بنانا چاہتی تھی وہ ماں۔"

"پھر کیا ہوا پاپا؟"

"گھر والوں نے لاکھ منت سماجت کی۔ نوکروں نے بھی خوشامد کی کہ وہ اپنے بیٹے کو اندر بلا لے۔ لیکن اس ماں نے کسی کی سفارش اور کسی کا کہنا نہ مان کر اپنے اس معصوم بیٹے کو رات بھر باہر ہی سردی میں پڑا رہنے دیا۔"

"رات بھر!" کئی آوازیں حیرت اور رحم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ٹکرائیں۔

"ہاں رات بھر۔" قدیر میاں بولے۔ "اور پھر صبح کو گھر والوں کی منت سماجت پر اس ماں نے اپنے بیٹے کو گھر میں بلایا۔ اور جب تک کہ اُس بیٹے نے اپنی اُس ملازمہ سے جس کے ساتھ اس نے بدتمیزی کی تھی ہاتھ جوڑ کر معافی نہیں مانگی، ان کی ماں نے اسے معاف نہیں کیا۔" پھر قدیر میاں نے کہا، "اور جانتے ہو تم لوگ کہ وہ ماں کون تھی اور وہ بیٹا کون تھا؟"

"نہیں نہیں۔ بتایئے پاپا۔"

"تو لو سنو۔" قدیر میاں نے بتایا "وہ ماں تھیں بی اماں۔ اور وہ بیٹا تھا محمد علی۔" پھر قدیر میاں نے وضاحت کی۔

"خالی خولی محمد علی نہیں جو لاکھوں ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ وہ محمد علی تھے جنہیں آج ساری دنیا مولانا محمد علی جوہر کے نام سے جانتی مانتی اور اُن کی عزت کرتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی کے چھوٹے بھائی۔ علی برادران، جن کی ماں کو ساری قوم بی اماں کے نام سے جانتی اور یاد کرتی ہے۔" قدیر میاں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مولانا محمد علی —— آزادئ وطن کے جاں فروش سورماؤں میں سے ایک بڑے ہیرو، جنہوں نے اپنے وطن ہندوستان کی آزادی کے لئے انگریز سے، اس برٹش سامراج سے ہمیشہ جنگ کی۔ اور پھر خانۂ کعبہ میں اپنے وطن کی آزادی کے لئے رات بھر سجدہ ریز رہ کر دعا کرتے کرتے مر گئے۔ جو بار بار سجدہ میں پڑے پڑے یہی کہتے رہے کہ اب وہ غلام ملک میں ہرگز نہ جائیں گے۔ جائیں گے تو اپنے وطن کی آزادی کا پروانہ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے جائیں گے۔ ورنہ یہیں ان کی قبر بن جائے گی —— اور پھر وہیں ان کی قبر بن گئی۔" قدیر میاں نے جذبات میں ڈوب کر کہا۔ اور پھر انہوں نے قہر آلود نظروں سے سرفراز کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا، "تم نے ہماری شبراتن بوا، ہماری ماں کے ساتھ بہت بڑی گستاخی کی ہے۔ لہٰذا تم اس وقت گھر سے باہر نکل جاؤ بدذات، بے رحم!" پھر انہوں نے اپنے بیٹے امجد سے کہا، "تم اس کے سارے کپڑے اُتروا کر اس کم بخت کو صرف ایک نیکر میں گھر سے ہمیشہ کے لئے باہر نکال دو، امجد ابھی نکالو اسے، ابھی اور اسی وقت!"

وہ غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور سرفراز اسی لمحے شبراتن بوا کے قدموں پر گر کر زور زور سے رونے اور معافی مانگنے لگا۔

شبراتن بوا اُسے اُٹھا کر اپنے گلے سے لگا چکی تھیں۔

■■

نئے ارادے

یہ ہم نے ٹھان لی ہے اور یہ ہم کر کے دکھا دیں گے
کہ اِس دُنیا کو، اِس دوزخ کو ہم جنّت بنا دیں گے

مٹا دیں گے دِلوں سے نقش نفرت اور عداوت کے
محبّت کا سبق ہم ساری دُنیا کو پڑھا دیں گے

محبّت اور کیا ہے، دو دِلوں کا ایک ہو جانا
جو دِل بچھڑے ہوئے دیکھیں گے ہم اُن کو ملا دیں گے

ہمارا دوست ہو، دُشمن ہو، اپنا ہو، پرایا ہو
جسے ہم دُکھ میں دیکھیں گے ہم اُس کا دُکھ مٹا دیں گے

وہ ہندو ہو، مسلماں ہو، وہ سِکھ ہو یا کلیسائی
جسے بے آسرا دیکھیں گے اُس کو آسرا دیں گے

وہ کعبے کا ہو رَہرو یا وہ بُت خانے کا ہو راہی
ہر اِک بھٹکے ہوئے کو راہ پر اُس کی لگا دیں گے

بنا دیں گے کہیں ہم گوردوارے اور کہیں گرجے
کہیں مسجد بنا دیں گے کہیں مندر بنا دیں گے

جو یہ چاہے گا، مر کر بھی وہ دُنیا میں رہے زندہ
اُسے اپنے وطن کے واسطے مرنا سِکھا دیں گے

جلائیں گے کسی کا آشیاں جس آگ کے شعلے
ہم اپنے خون سے اُس آگ کے شعلے بُجھا دیں گے

کریں گے پیار ہم نفرت کے مُجرم سے بھی اخلاقاً
سزا دیں گے اُسے لیکن محبّت کی سزا دیں گے

ہمارے حق میں اُن کی بد دُعائیں بھی دُعا ہوں گی
اگر ہم بد دُعائیں دینے والوں کو دُعا دیں گے

بلا سے ڈوب جائے کوئی ہم ہیں سے، مگر ہم تو
کسی کی ڈوبتی کشتی کو ساحل سے لگا دیں گے

اگر کہسار و صحرا میں بھی کوئی تشنہ لب ہوگا
تو ہم کہسار و صحرا میں بھی اِک دریا بہا دیں گے

مُبارک سالِ نَو آیا، مُبارک سالِ نَو آیا
یہ نغمہ حضرتِ بسمل کا ہم سب کو سُنا دیں گے

بسمل سعیدی
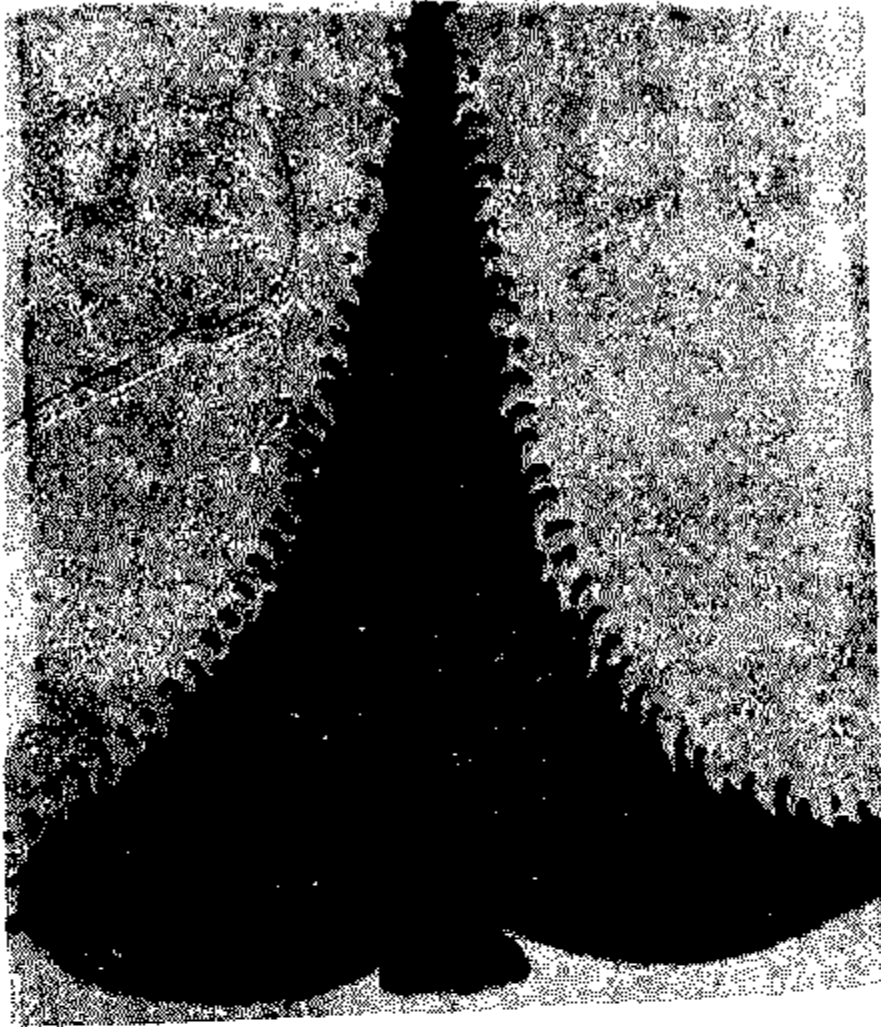
◄ ترکی کے سلطان ابراہیم اوّل کے شاہی دستخط کی مہر ایک مور کا پر تھی! ۱۶۴۰ء میں شاہی باغات میں ایک مور کی دُم کے پروں پر ایسے نشانات نظر آئے جو سلطان کے نام کے حروف سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے بعد ہی سے اس مور کا پر شاہی مہر کے طور پر استعمال ہونے لگا۔

▲ اسکیپ (ایک قسم کی سیپ مچھلی) کی سو چمکیلی سبز آنکھیں ہوتی ہیں ہر آنکھ میں لینس بھی ہوتا ہے، تصویر بنانے والا عدسہ بھی اور نظر کا دماغ سے تعلق جوڑنے والی رگ بھی۔

بحرِ ہند کے ایک جزیرے ری یونین میں ایک ناگ پھنی کا پودا ایسا ہوتا ہے جس میں پچاس برس میں صرف ایک بار پھول کھلتا ہے۔ ▼

◄ ریت اتنی سرخ بھی ہوتی ہے جیسے خون! جنوبی مغربی افریقہ کے نامیب ریگستان میں ریت واقعی ایسی ہی لال ہے۔ دراصل وہاں ریت کا ہر ذرہ زنگ (آئرن آکسائڈ) کے پتلے سے خول میں بند ہے۔

سب سے بوڑھا سپاہی شاید انورالدین (۱۶۴۲ تا ۱۷۴۹) تھا۔ وہ ارکاٹ (دکھنی بھارت) کا نواب تھا۔ آمبور کی لڑائی میں وہ ۱۰۷ برس کی عمر میں اپنی فوج کا سالار بن کر میدان میں آیا۔ وہ ہاتھی پر سوار تھا۔ اسی لڑائی میں دو گولیوں نے اسے موت کی گود میں پہنچا دیا۔

ڈاکٹر ایلین بمبارڈ ایک فرانسیسی جاں باز تھا جس نے اٹلانٹک ساگر بغیر کھانا پانی کے پار کیا۔ ایک چھوٹی کشتی کے سہارے اس نے کناریز سے بار بیڈوز تک کا فاصلہ ۶۵ دن میں طے کیا۔ راستے میں اس نے صرف سمندری پانی اور ان مچھلیوں پر گزر بسر کی جو وہ سمندر میں سے پکڑ لیتا تھا۔ یہ ۱۹۵۲ کا واقعہ ہے۔

سالنامہ
کھلونا
نئی دہلی

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

سفید جھوٹ

پرستان میں، جہاں بہت سی پریاں رہتی ہیں۔
سبز پری، لال پری، نیلم پری
ہاں اسی پرستان میں
نیلم پری کی چھوٹی سی، بھولی بھالی، خوب صورت بیٹی بھی
رہتی تھی ـــــ ننھی سی پری گڑیا جیسی۔
اس کا نام تھا زمرد پری۔
سب پیار سے اسے تتلی کہتے تھے۔ جب
اس کی ماں دُور اونچے نیچے
پہاڑوں کی طرف چلی جاتی
تو ننھی تتلی اپنی پیاری گڑیا،
اور خوب صورت چمک دار
چھوٹے بڑے پتھروں سے کھیلتی رہتی۔

تتلی کی ماں جب بھی کہیں جاتی،
اپنی بچی کے لئے
چھوٹے بڑے چمک دار، رنگین
خوب صورت پتھر

ضرور لے کر آتی۔ ننھی تتلی رنگین پتھروں کو دیکھ کر بہت
خوش ہوتی۔ اِن پتھروں سے وہ اپنی اکلوتی گڑیا کا گھر
بناتی، اپنی گڑیا کے لئے ہار بناتی، تاج بناتی۔ اپنی
گڑیا کے چھوٹے چھوٹے گھروندوں کو طرح طرح سے سجاتی
اس نے پرستان میں اپنی گڑیا کے لئے کئی گھروندے
بنا رکھے تھے اور ان خوب صورت اور رنگین پتھروں
سے ہر گھروندے کو سجا رکھا تھا۔

ایک شام ایسا ہوا کہ نیلم پری کہیں سے آئی تو اُس
نے اپنی ننھی تتلی کو پانچ خوب صورت پتھر دئے اور یہ
بتایا کہ یہ پانچ پتھر اسے سمندر کی گہرائیوں سے ملے ہیں
اس لئے اس انمول پتھروں کو وہ سنبھال کر رکھے۔

یہ پتھر مختلف رنگوں کے تھے۔ ایک پتھر اتنا سُرخ
تھا کہ اس سے سُرخ روشنی نکل رہی تھی۔ دوسرا پتھر اتنا
سیاہ تھا کہ اس سے کالے رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔
اسی طرح دوسرے پتھروں سے رنگین روشنیاں نکل رہی تھیں
تتلی اِن پتھروں کو پا کر بہت خوش ہوئی، جب رات
ہو گئی تو اندھیرے میں وہ ہر پتھر کی روشنی کو دیکھ دیکھ کر
پھولی نہ سماتی۔

اسی رات آسمان پر کالے کالے بادل گِھر آئے اور
دیکھتے ہی دیکھتے لگے بادل گڑگڑانے — کڑکڑ کڑکڑ کڑاک!
پھر زوروں کی بارش شروع ہو گئی۔ کبھی اِدھر بجلی گرتی کبھی
اُدھر۔ ہوا اتنی تیز کہ توبہ ہی بھلی۔ ہوا کا ہے کو تھی طوفان
تھا طوفان! ننھی تتلی جو بے خبر سو رہی تھی — بادلوں کی
کڑک سُن کر جاگ پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں ایک
طرف بے خبر سو رہی ہے اور کمرے میں ان پانچ پتھروں کی
روشنیاں پھیلی ہوئی ہیں

وہ آہستہ سے اُٹھی اور اُس نے اپنا چاندی جیسا
چمکتا ہوا وہ خوب صورت صندوق کھولا جس میں وہ اپنے
پتھروں کو رکھتی تھی اور لگی رکھنے اُن پتھروں کو۔
پہلے اُس نے سُرخ پتھر کو اُٹھایا اور رکھ دیا۔
اس کے بعد نیلے رنگ کے پتھر کو اُٹھایا۔
پھر انگوری رنگ کے پتھر کو
اور اس کے بعد سبز رنگ کے پتھر کو۔

ان پتھروں کی ملی جُلی روشنی سے اس کا صندوق جگمگا
اُٹھا۔ اب صرف ایک ہی پتھر باقی رہ گیا تھا — کالے رنگ
کا پتھر، جس سے سیاہ روشنی نکل رہی تھی۔

ننھی تتلی کو یہ سیاہ رنگ کا پتھر پہلے بھی پسند نہیں آیا تھا
کالی روشنی بھلا کسے پسند آتی ہے؟ اس سیاہ پتھر کی
کالی روشنی کو دیکھ کر اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی
پُرانے مٹی کے چراغ سے کالا دھواں پھیل رہا ہو اور
اس کا کاجل نیچے گِر رہا ہو۔ اُس نے سوچا کہ اس پتھر کو
بھی جلدی سے بند کر دے صندوق میں۔

ابھی اس نے اِس پتھر کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ
باہر بادل زور سے کڑکے — اتنی زور سے کہ ننھی تتلی کا
دِل بیٹھنے لگا، اور اسی وقت اس کالے پتھر سے سفید دھواں
نکلنے لگا۔ ایک تو اس کی روشنی کالی تھی اور پھر اس سے
سفید دھواں نکل رہا تھا، اور اس دھوئیں میں ایسی بدبو
تھی، ایسی بدبو کہ برداشت نہ ہو۔ عجیب منظر تھا تتلی کے
سامنے، وہ گھبرا گئی کہ یہ ماجرا کیا ہے۔

اسی وقت اس کالے پتھر سے آواز آئی "مجھے بند
نہ کرو! مجھے بند نہ کرو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"
تتلی کو سخت حیرت کہ یہ کالا کلوٹا پتھر آخر بول
کس طرح رہا ہے۔ اس کے مونھ میں زبان کہاں سے آگئی

تتلی نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ابھی بند نہیں کرتی۔ لیکن یہ تو بتاؤ اے کالے پتھر، تمہاری روشنی تو سیاہ ہے لیکن تمہارے بدن سے یہ سفید دھواں کس طرح نکل رہا ہے اور اس دھوئیں میں اتنی بدبو کیوں ہے؟"

کالے پتھر نے جواب دیا "پہلے اس صندوق کو بند کرلو، پھر سب کچھ بتا دوں گا۔"

تتلی نے ایسا ہی کیا۔

اب کالے پتھر نے کہنا شروع کیا "اے خوبصورت ننھی پری، میں پتھر کی صورت میں ایک انسان کی روح ہوں ——۔"

"روح —— ؟" ننھی تتلی پریشان ہوگئی۔

"ہاں ننھی، میں ایک انسان کی روح ہوں۔" کالے پتھر نے کہا۔

"کس انسان کی روح؟" اب تتلی کی دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔

کالے پتھر نے کہا "انسان نے جب اس دنیا میں جنم لیا، اس وقت ہر آدمی سچا تھا، سچ بولتا تھا، مرد عورت بچے، سب سچ بولتے تھے۔ جس انسان نے سب سے پہلے جھوٹ بولا اور صاف اور سفید جھوٹ بولا، میں اسی کی روح ہوں۔"

"تم جھوٹ کی روح ہو؟" تتلی نے حیرت سے پوچھا

"ہاں، میں اس پہلے انسان کی روح ہوں، جس نے اس زمین پر پہلی بار جھوٹ بولا۔ اس سفید جھوٹ کی وجہ سے اس دنیا میں سب سے پہلے انسانوں کی لڑائی ہوئی ایسی لڑائی ہوئی کہ ہزاروں انسان مارے گئے۔ یہ انسان کی اس دھرتی پر پہلی جنگ تھی۔ یہ سب کچھ میری وجہ

شکاری کون —— ؟

سے ہوا۔ جب سچائی نے اپنی روشنی پھیلائی تو میرا بھید کھل گیا۔ اور پہلے دور کے انسانوں نے مجھے سخت سزا دی۔ انہوں نے مجھے سمندر کی گہرائیوں میں رکھ دیا تاکہ میں پھر کبھی اوپر نہ آؤں۔"

"تو اسی لئے تمہاری صورت ایسی ہے ——" تتلی نے کہا ——

"میں نے انسان کی بھلائی کے لئے سفید جھوٹ بولا تھا —— صاف جھوٹ۔ میں ہمیشہ انسان کی بھلائی چاہتا ہوں کہ کسی صورت سے کوئی مجھے سمندر سے باہر نکالے اور میں باہر آکر اپنے سفید دھوئیں کو ساری دنیا میں پھیلاؤں، تاکہ ہر طرف سفید جھوٹ بولنے والے پیدا ہوجائیں اور میں اسی طرح انسان کی خدمت کرتا رہوں۔"

"تو اسی لئے اس سفید دھوئیں میں اتنی بدبو ہے" تتلی نے کہا۔

"میری بدبو پر نہ جاؤ، میرے جسم کا یہ دھواں میری روح کی یہ کالی روشنی انسان کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ سفید جھوٹ سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب مجھے بچائیے

"فائدے ؟" تتلی نے چونک کر پوچھا۔
"بہت فائدے ۔ ایک ذرا جھوٹ بولو اور کام بن جائے
قاتل قتل کرے اور عدالت میں جھوٹ بولے اور سفید جھوٹ
بول کر بچ جائے ۔ بچہ اسکول میں اپنے اُستاد سے جھوٹ بولے
اور مار کھانے سے بچ جائے ۔ قرض لینے والا صاف ، سفید
جھوٹ بول جائے اور روپے ہضم کرلے ۔ قدم قدم پر سفید
جھوٹ کے فائدے ہیں" کالے پتھر نے ننھی تتلی کو سمجھایا۔
تمہاری کالی روشنی دیکھ کر مجھے پہلے ہی شبہ ہوا تھا
کہ تم ان خوب صورت اور روشن پتھروں سے الگ ہو۔ مجھے
افسوس ہے کہ میری ماں تمہیں بھی ان پتھروں کے ساتھ یہاں
لے آئی ۔ تمہیں وہیں رہنا چاہئے تھا ـــــ" تتلی نے کالے
پتھر سے کہا۔

"اب تو میں ہزار اور کروڑوں برسوں کے بعد باہر
نکل آیا ہوں ۔ مجھے اپنا کام کرنے دو، تم سے صرف یہی کہنا
ہے کہ مجھے اسی وقت پرستان سے دُنیا میں پہنچا دو ـــــ
انسانوں کی دُنیا میں ، جہاں میں اپنے سفید جھوٹ کے
دھوئیں کو ہر طرف پھیلا دوں" کالے پتھر نے تتلی سے
التجا کی ـــــ

تتلی کو غصہ آگیا ۔ اُس نے کہا " یہ نہیں ہو سکتا
تم سفید جھوٹ ہو ۔ تم انسانوں کی دُنیا میں جاؤ گے تو ہر
طرف بُرائی پھیلے گی ۔ ننھے معصوم بچے جھوٹ بولیں گے، اس
سے ان کا بڑا نقصان ہوگا ۔ ہر طرف نفرت پھیلے گی ، جنگ
ہوگی ، قتل ہوں گے ۔ غلط فیصلے ہوں گے ۔ بچے جھوٹ
بول کر اسکول کا کام نہیں کریں گے ۔ اس لئے وہ کبھی اچھی
تعلیم حاصل نہیں کر سکتے ۔ میں تمہیں انسانوں کی دُنیا میں
ہرگز ہرگز نہیں لے جاؤں گی "

یہ سُن کر کالا پتھر کچھ دیر تو خاموش رہا اور تیز تیز
دھواں ، بدبو سے بھرا ہوا دھواں پھینکتا رہا ۔ پھر اس نے
ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے قہقہے کے ساتھ باہر
بادل گرجنے لگے ـــــ زور سے ـــــ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑ کڑاک
اور دیکھتے ہی دیکھتے ننھی پری یعنی تتلی اونگھنے لگی ۔ جانے
اس کالے پتھر کے اس دھوئیں میں کیا اثر تھا کہ تتلی دیکھتے
ہی دیکھتے سو گئی ۔ اور پھر وہ نیند میں اُٹھ کر اپنے خوبصورت
خوب صورت پروں کو سنبھال کر چلنے لگی ۔ چلتے چلتے اُس
کالے پتھر کے پاس آئی اور اسی نیند کی حالت میں اسے
اٹھا کر باہر نکل آئی ۔ باہر نکل کر نیند ہی کی حالت میں
وہ اُڑنے لگی اور اُڑتے اُڑتے انسانوں کی دُنیا میں
پہنچ گئی ، اور اسی حالت میں اس نے بلندی سے اُس
کالے پتھر کو نیچے گرا دیا ۔ زمین پر گرتے ہی یہ کالا پتھر
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور ہر طرف بکھر گیا ۔ تتلی پر نیند
طاری تھی ، وہ نیند میں اسی طرح اُڑتے اُڑتے واپس
پرستان آگئی اور اپنی ماں کے پاس جاکر سو گئی ـــــ
بے خبر ـــــ

دُنیا میں وہ کالا پتھر، سفید جھوٹ کا دھواں پھیلانے والا پتھر جو بنہ جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا، ہر طرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور ریزوں میں سفید جھوٹ کا بدبُودار دھواں پھیلانے لگا۔

صبح کو جب ننھی تتلی کو رات کی بات یاد آئی تو وہ اپنی ماں سے اجازت لے کر اس دُنیا میں آ گئی اور ہر انسان اور ہر بچّے کے کان میں کہنے لگی "میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کالے پتھر کے دھوئیں سے میں نیند میں اُڑنے لگی تھی اور یہ پتھر ہی مجھے اس دنیا میں لایا تھا اس پتھر کے دھوئیں سے اس سفید جھوٹ کے دھوئیں سے ہوشیار رہو۔"

تب سے اب تک یہ دونوں اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کالے پتھر کا ہر ٹکڑا سفید جھوٹ کی تعلیم دے رہا ہے اور ہر انسان کے دل و دماغ میں بیٹھ کر جھوٹ کی تعلیم دے رہا ہے اور وہ ننھی تتلی جو اب بہت بڑی اور بہت بوڑھی ہو چکی ہے، یہ کہہ رہی ہے کہ اس دھوئیں سے دور رہو سفید جھوٹ کا دھواں جب بھی کسی بچّے کے اسکول کے بستے میں گھس جاتا ہے تو تتلی اسے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ دونوں اپنے کام میں لگے ہوتے ہیں۔ بے چاری تتلی ہر بچّے کے پاس جاتی ہے، ہر عدالت میں جاتی ہے، ہر گھر میں جاتی ہے، ہر اسکول میں جاتی ہے۔ سفید جھوٹ کے دھوئیں کو دُور کرنے کے لئے وہ تمہاری مدد چاہتی ہے بچو۔ ظاہر ہے تم تتلی کی مدد ضرور کرو گے۔ ارے ذرا اپنے پیارے رسالہ کھلونا سے نظر ہٹا کر دیکھو، سفید جھوٹ کا دھواں تمہارے اسکول کے بستے میں گھس رہا ہے ـــ بھگاؤ اسے ـــ بھگاؤ اسے!

■ ■

ہمارے بچے
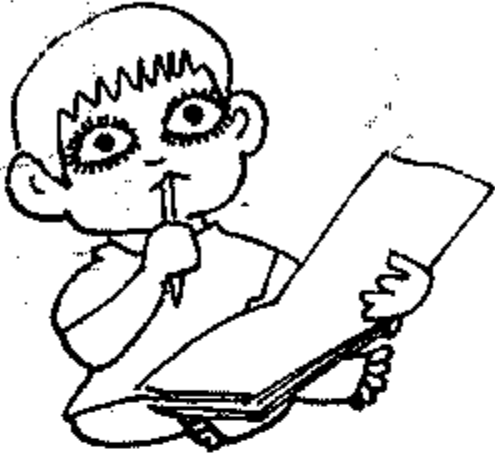
کبھی غل مچائیں کبھی گانا گائیں
کبھی ممی ڈیڈی کو گھر میں نچائیں
جو چھٹی کا دن ہو تو طوفاں ہو گھر میں
قیامت سے پہلے قیامت اٹھائیں

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

کبھی اپنے ڈیڈی کے جوتے چھپا دیں
کبھی اپنی ممی کے جھمکے چھپا دیں
کبھی چین سے بیٹھنا یہ نہ جانیں
یہ دادی کو نانی کو پاگل بنا دیں

شرارت بھی اُن کی نرالی نرالی
کریں شکل سیاہی سے ہر دم یہ کالی
اگر کوئی ان کو پکڑنے کو بھاگے
تو پھر سب ہی مل کر بجاتے ہیں تالی

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

حسرت جے پوری

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

کبھی سارے کمروں کو کرتے ہیں کالے
بناتے ہیں فوٹو بڑالے بڑالے
جو دھمکاؤ ان کو تو پھر روٹھ جائیں
کئی توڑ ڈالے ہیں پینے کے پیالے

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

جب آپس میں ہو جائے ان کی لڑائی
دہائی خدا کی دہائی
بنا دیں لڑائی کا میدان گھر کو
ستم ہے ستم ان کی یہ ہاتھا پائی

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

اگر ضد پہ آئیں تو روتے رہیں گے
جو سونے پہ آئیں تو سوتے رہیں گے
ہے سردی کا موسم نہیں مانتے وہ
وہ پانی میں کپڑے بھگوتے رہیں گے

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

جب آئے کھلونا تو ہو چھینا جھپٹی
کبھی ان کی آپس میں اک دن نہ بنتی
شیطاں کے ابا ہیں شیطاں بھی بھاگے
غضب ہے غضب ان کی معصوم ہستی

شرارت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے
قیامت بھرے ہیں ہمارے یہ بچے

جگنو میاں کی دُم

م، ک، مہتاب

آپ نے جگنو تو ضرور اُڑتے دیکھے ہوں گے اور باغیچوں میں اُنہیں پکڑنے کے لئے اُن کا پیچھا بھی کیا ہوگا۔ لیکن آپ شاید یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ یورپ کے بعض ملکوں میں اور بحرالکاہل کے کچھ جزیروں میں جگنو اسی طرح پالے بھی جاتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں پالی جاتی ہیں۔ ان جگنوؤں کی روشنی ہمارے ہاں کے جگنوؤں کے مقابلے میں زیادہ تیز اور زیادہ دل کش ہوتی ہے۔ بچے انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ نے یہ شعر سنا بھی ہوگا:

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

بچے تو انہیں دیکھ کر خیر خوش ہوتے ہی ہیں، وہاں جگنو سڑکوں پر رات کے وقت فروخت بھی ہوتے ہیں۔ گول غباروں میں یا جالی کے چنڈولوں میں جگنو بھر دیے جاتے ہیں۔ جوان لڑکیاں انہیں ہاتھ میں تھام کر اپنی خوبصورتی اور لباس کی دل کشی میں اضافہ کرتی ہیں۔ لوگ ان چنڈولوں کو رات کے وقت گھروں میں لٹکاتے ہیں۔

آپ نے اپنے یہاں بھی یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے دیکھے ہوں گے جن کی دُم رات کو کبھی روشن ہو جاتی ہے اور کبھی اندھیری۔ عام طور پر ان کیڑوں کی لمبائی آدھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن امریکہ میں ایک ایسا جگنو پایا جاتا ہے جس کی لمبائی تین انچ ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کے دس بارہ جگنو کسی بوتل میں بند کر کے کمرے میں رکھ دیے جائیں تو یہ بوتل پورے ٹیبل لیمپ کا کام دیتی ہے۔ کیوں کہ اس طرح جگنو کی دُم سے بڑی تیزی کے ساتھ سرخ اور سبز روشنیاں نکلتی رہتی ہیں۔

برازیل کا جگنو لمبائی کے لحاظ سے دوسرے درجے پر ہے۔ یہ دو انچ لمبا ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ جگنو کو اندھیرے کمرے میں کتاب پر سطروں کے ساتھ ساتھ گھمایا جائے تو اس کی روشنی میں وہ سطر صاف دکھائی دیتی ہے ___ اس کے انڈے بھی

چمک دار ہوتے ہیں۔ برازیل میں اب بھی جگنوؤں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ لوگ انہیں بید کی ٹوکریوں میں بند کر لیتے ہیں، اور رات کو سفر میں روشنی کے لئے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ عورتیں انہیں دھاگے میں پرو کر بالوں میں ٹانکتی ہیں اور یہ رات کو ان کی زلفوں میں ہیرے اور یاقوت نظر آتے ہیں۔ قومی تہواروں پر جگنوؤں کی خوب خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جگنو کیسے چمکتے ہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جگنو روشنی کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کے ماہروں نے جو کھوج کی ہے، اس سے پتہ چلا ہے کہ جگنو کے جسم میں دو کیمیکل (مادے) ہوتے ہیں: لوسفرین اور لوسفریز — لوسفرین جگنو کی لالٹین کے لئے گویا تیل ہے اور لوسفریز اس تیل کو پہنچانے کے لئے پائپ کا کام دیتا ہے۔ جگنو کا سانس لینے کا عمل روشنی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

جگنو ہوا متواتر اندر نہیں لے جا سکتا۔ اس لئے کبھی وہ روشن ہو جاتا ہے اور کبھی اندھیرا۔ اگر وہ تیز تیز سانس لینا شروع کر دے تو متواتر روشن دکھائی دے سکتا ہے۔

جگنو کی روشنی خود اس کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ بہت سے دوسرے کیڑے اور پرندے جو کیڑوں کو کھاتے ہیں اسے جلتی ہوئی آگ سمجھ کر اس کے نزدیک نہیں آتے۔ چمگادڑ اور اُلّو اس سے بہت ڈرتے ہیں، ان کا ڈر بے معنی ہے، اس لئے کہ چاند کی روشنی کی مانند جگنو کی روشنی بھی ٹھنڈی ہے، اور اس سے کوئی چیز نہیں جل سکتی۔ پھر بھی اس میں روشنی کافی ہوتی ہے۔ اگر جگنو کے وزن کی موم بتی جلائی جاتے تو اس کی روشنی جگنو کی روشنی کے دسویں حصے کے برابر ہوگی۔

دن کے وقت جگنو بدبودار پتوں، گیلی گھاس اور فصلوں میں چھپا رہتا ہے۔ رات کے وقت باہر نکلتا ہے اور اس وقت جنگل میں تارے سے اُڑتے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ باغ لہلہاتے سبزہ زار اور ندی کے کنارے اس کو سیر کے لئے بہت مفید ہیں۔

جگنو گوشت خور کیڑا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے کھاتا ہے۔ یہ بڑے ماہر شکاری کی طرح شکار کرتا ہے، بلکہ پہلے اپنے شکار کو بے ہوش کر لیتا ہے۔ پھر کھاتا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ جگنو اپنے شکار کو کھاتا نہیں، پی جاتا ہے۔ جگنو کے مونہہ میں چمٹے جیسے دو اُدنا ہوتے ہیں، ان کی مدد سے وہ ایک لیس دار مادّہ اپنے شکار کے جسم میں داخل کر دیتا ہے۔ یہ مادّہ اس کیڑے یا شکار کو گوشت کی بجائے ایک لیس دار سیال میں بدل دیتا ہے اور جگنو اپنے مونہہ کی نلکیوں سے اس مادّے کو پی جاتا ہے۔

جگنو کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں، لیکن ان کی مدد سے وہ درخت یا دیوار پر چڑھ نہیں سکتا۔ وہ اپنے جسم سے ایک لیس دار مادّہ خارج کرتا ہے جس سے چپک چپک کر وہ دیوار یا درخت کے ساتھ اوپر چڑھ جاتا ہے۔

آپ نے اس کیڑے کے متعلق اتنا کچھ جان لیا۔ اس پر بھی وہ آپ کے لئے رات کو فضا میں اُڑنے والا ستارہ ہی ہے، جس کو دیکھ کر آپ اس کے بارے میں سب کچھ بھول جائیں گے اور اس کا پیچھا کریں گے یا خوشی سے تالی بجانے لگیں گے۔ ■■

بچوں کے لئے سبق آموز کہانیاں

کتاب	قیمت
کھٹ پٹ	پچاس پیسے
قصہ چار خرگوش	ایک روپیہ
کھودا پہاڑ نکلا چوہا	بیس پیسے
لُوٹ کے بدھو گھر کو آئے	بیس پیسے
لاٹھی کا سانپ	پچپن پیسے
آپ کی آنکھیں	ایک روپیہ
ببر شیر	پچھتر پیسے
بھارت کی کہانی بھارت کی زبانی	پچھتر پیسے
پُر سکون گھریلو زندگی	ایک روپیہ پچاس پیسے
پٹرولیم کی کہانی	سینتیس پیسے
پنچایتی راج	پچیس پیسے
چاند کی طرف پہلا قدم	دو روپے
چاند کی کہانی	ایک روپیہ پچاس پیسے
سورج اور اس کا گھرانہ	پچاس پیسے
قدرتی گیس کی کہانی	سینتیس پیسے
کاربن کی کہانی	ایک روپیہ پچاس پیسے
پہیلیاں	پچاس پیسے
دُنیا سے الگ چاند	ایک روپیہ پچاس پیسے
ہیرے کی کہانی	سینتیس پیسے
ہندوستان شاہراہ ترقی پر	ایک روپیہ پچاس پیسے
لاٹھی والا جن	تیس پیسے
گمشدہ شہزادی	چالیس پیسے
مغرور شہزادی	ساٹھ پیسے

کتاب	قیمت
مچھلی والے نبی	بیس پیسے
مغل شہزادہ	بیس پیسے
مسافر شہزادی	چالیس پیسے
مکھن کا ڈبہ	پچیس پیسے
میاں مٹھو	اکتیس پیسے
منّی کا پرستان	تیس پیسے
میاں جی بجری	انیس پیسے
مسکین شہزادی	اکتیس پیسے
نبی کا بیٹا	بائیس پیسے
ننھی منّی کہانیاں	بیس پیسے
ناگ شہزادہ	تیس پیسے
وطنی نظمیں	بیاسی پیسے
یادگار انگوٹھی	چھتیس پیسے
ہماری نعت	تیس پیسے
ہزاروں برس میں	ایک روپیہ پچاس پیسے
فارسی کی دوسری	چھپن پیسے
دینیات کا رسالہ	بیس پیسے
جادو کی گڑیا	انیس پیسے
کچھ نئی ایجادیں	پچھتر پیسے
گھڑی کی کہانی	پچھتر پیسے
گرم چائے	اُنیس پیسے
ارمان نبی	ایک روپیہ
جادو کی بندوق	ساٹھ پیسے

کھلونا بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

گھوں گھوں . . . گھر، گھر، گھوں گھر . . . .

وہ اس آواز پر چونکے ہوگئے۔ دیر سے وہ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے باہر جھانک رہے تھے۔

باہر سے دیکھنے والے کو صرف پہاڑ اور غار اور اندھیرا نظر آتا تھا، جیسے وہاں کسی جان دار کا وجود ہی نہ ہو — حالانکہ اتنے بہت سے جان دار چھپے ہوئے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

ایک بہت بڑی مکڑی نے زمین پر اپنے پیر دھنسا دیے، جیسے وہ ہمیشہ کے لئے اس جگہ پر فٹ ہوگئی ہو۔ پھر اُس مکڑی نے اور بھی جال پھیلایا۔ اُس کے پیٹ میں سے ذرا سہما سا ایک خول برآمد ہوا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے زمین پر پاؤں ٹیکایا اور پھر اُچھل پڑا جیسے اس کے پاؤں میں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، اور پھر اس نے ہمت کر کے زمین پر

قدم رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد مکڑی کے پیٹ سے ایک خول اور نکلا اور دونوں لگے چہل قدمی کرنے، جیسے کسی باغ میں تفریح کر رہے ہوں۔ وہ دُور دُور تک گھومتے ہوئے چلے گئے۔ فخر سے اکڑتے ہوئے۔

"یہ تو مُردہ زمین ہے۔۔۔" ایک خول سے آواز آئی، "یہاں تو زندگی کی کوئی رمق نہیں ہے۔ نہ سبزہ، نہ پانی، نہ ہَوا۔ کوئی جان دار یہاں زندہ رہ بھی کیسے سکتا ہے؟"

"مگر اِس مُردہ زمین پر بھی ہم زندہ انسان نظر آ ہی گئے۔" دوسرے خول سے آواز آئی۔

"لیکن ہم تو یہاں رہ کر بھی اپنی ہی دُنیا کی آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔" پہلا خول بولا اور پھر دونوں خول ہنس پڑے۔

وہ اونچی سطح پر پھُدکتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

"آگے تو بالکل اندھیرا ہے۔" ایک خول پھر بولا۔

"ہاں، جب زندگی کے آثار نہیں ہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" دوسرے خول نے کہا۔

دونوں خول باتیں کر رہے تھے اور اس مُردہ زمین کے زندہ باسی اُن کی باتیں سُن سُن کر ہنس رہے تھے۔

"مُردہ زمین!" ایک نے دوسرے کو ٹھوکا دے کر اپنا قہقہہ دَباتے ہوئے کہا۔

"گویا ہم مُردہ ہیں ۔۔۔ ہا ہا ہا! مجھے تو اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو رہی ہے۔"

"زور سے مت ہنسو ۔۔۔" دوسرے نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا "دیکھو کیا مزے سے یہ لوگ ہماری زمین کی مٹی کھود رہے ہیں، گویا سارا خزانہ اس مٹی میں دَبا ہوا ہے اور یہ اس کو بٹور بٹار کر لے جائیں گے۔"

"ہاں، انہیں کیا خبر یہاں کا اصلی خزانہ کیا ہے۔" ایک بولا۔

"مگر اس کی تو انہیں طلب ہی نہیں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"طلب کیسے ہو؟ غار کے پچھلے حصّے سے بہت سے آکر جمع ہو گئے اور ہنستے ہوئے بولے، "یہ جنگ جُو لوگ ہیں ۔۔۔ ایٹم بموں کے گدلے اور کثیف دُھوئیں میں سانس لینے والے، لڑنے بھڑنے میں ماہر، تباہیوں میں گھرے ہوئے ۔۔۔ انہیں امن اور سکون کی کیا قدر ہو سکتی ہے؟"

"یہ تو امن و سکون کو بے جھجک موت کہہ دیتے ہیں۔" ایک ہنس کر بولا "ہماری زمین کو مُردہ کہہ رہے ہیں!"

"ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" دوسرے نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی، ہمارے ہاں نہ جنگیں ہوتی ہیں، نہ دُشمنی کی آگ بھڑکتی ہے۔ نہ نفرت کی چنگاریاں اُڑتی ہیں، نہ بے گناہوں کے خون سے زمین لالہ زار رہتی ہے۔ نہ غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے، نہ ماں بہنوں کی عزت کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ تب تو ہم مُردہ ہی ٹھہرے.... ہا ہا ہا!"

"او ہو ہو ہو" تیسرے نے زور سے ہنس کر کہا "اور یہ لوگ خود کو زندہ سمجھتے ہیں! واہ بھئی واہ! ایسی ایسی آگ میں جل کر بھی یہ زندہ ہیں! زندہ ہوں گے، مگر عقل اور شعور تو مَر چکا۔"

"مگر عقل اور شعور کا دعویٰ تو اب بھی کرتے ہیں۔" ایک مسکرا کر بولا۔

"دعوے سے کیا ہوتا ہے؟" دوسرے نے ہنس کر کہا "یہ سب عقل اور شعور کے تقاضوں سے قطعی ناواقف ہیں۔ بھلا بُرائیوں کو بھی کبھی عقل تسلیم کر سکتی ہے؟ عقل کا تقاضا ہے انسانیت سے محبت، اتفاق و اتحاد، امن و سکون، ترقی و خوشحالی

اور خدمت ـــــ مگر یہ لوگ تو اپنی ساری صلاحیتوں کو جنگ، دشمنی اور نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھسم کر رہے ہیں۔"

"ہماری پاک، پوتر زمین کی مٹی کو" ایک اور نے ہنس کر کہا "جب یہ اپنی دنیا کی کسی لیبوریٹری میں تجزیہ کے لئے لے جائیں گے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اس میں انسانی خون کا اثر تک نہیں ہے، جب کہ ان کی زمین کی مٹی انسانی خون سے سُرخ ہو کر سڑ چکی ہے۔"

"کہیں یہ لوگ ہماری دنیا میں بھی یہی آفتیں نہ لے آئیں۔" ایک نے کچھ خوف زدہ ہو کر کہا۔

"ان کا کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے۔" دوسرے نے جواب دیا "یہ لوگ رنگ و نسل، ذات پات اور اونچ نیچ کے جھگڑے کھڑے کر کے آپس ہی میں کٹ مرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو کیا بخشیں گے؟ ان کی ساری طاقتیں ایسی ہی خرافات میں صرف ہوتی ہیں۔"

"تب تو اس کا کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔" ایک بولا۔

"ایک ہی انتظام ہو سکتا ہے۔" ایک بچے نے رائے دی۔

"وہ کیا؟" سب اس بچے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا ان کی دنیا میں بچے بھی ہوتے ہیں؟" اسی بچے نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، بالکل تمہارے ہی جیسے۔" کسی بوڑھے نے بچے کو پیار کر کے کہا۔

"بہت ٹھیک ہے۔" بچے نے کہا "ہم ان کی دُنیا کی اس نسل کو سنوارنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ نئی نسل امن اور شانتی کی پیغام بر بن گئی تو سمجھئے ان کی پوری دنیا سنور جائے گی۔"

آفریں آفریں، شاباش شاباش کی آوازوں سے غار گونج اٹھا۔

تم مزے میں رہے ـــــ کم ازکم تمہارے ہاتھوں میں تو تکلیف نہیں ہو رہی ہوگی۔

"ہمیں ان بچوں کو امن اور شانتی کا پیغام بھیجنا چاہیئے۔" بچے نے کہا۔

"ضرور ضرور ـــــ ضرور بھیجنا چاہیئے۔" بہت سے بچے چلا اُٹھے۔ "ہم ان کے پاس یہ پیغام ضرور بھیجیں گے کہ وہ لڑائی اور خوں ریزی جیسی ہولناک چیزوں سے بچیں محبت، پیار اور اتفاق سے زندگی گزارنا سیکھیں۔ یہی سب سے بڑی دولت ہے۔"

"جس طرح ہم اس دولت سے مالا مال ہیں۔" سب بچے پھر بول اُٹھے۔

اور ان بچوں کے سب بڑے اور بزرگ انہیں پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

تو بھئی بچو، اگر چاند کی دنیا کے معصوم بچوں نے تمہارے پاس یہ پیغام بھیجا تو اس کو قبول کرو گے نا ـــــ؟

■ ■

یہ عجیب و غریب پرند شور تو مچائے گا ہی
تم بھی شور مچاؤ گے ،
اگر تمہاری دم میں آگ لگی ہو!
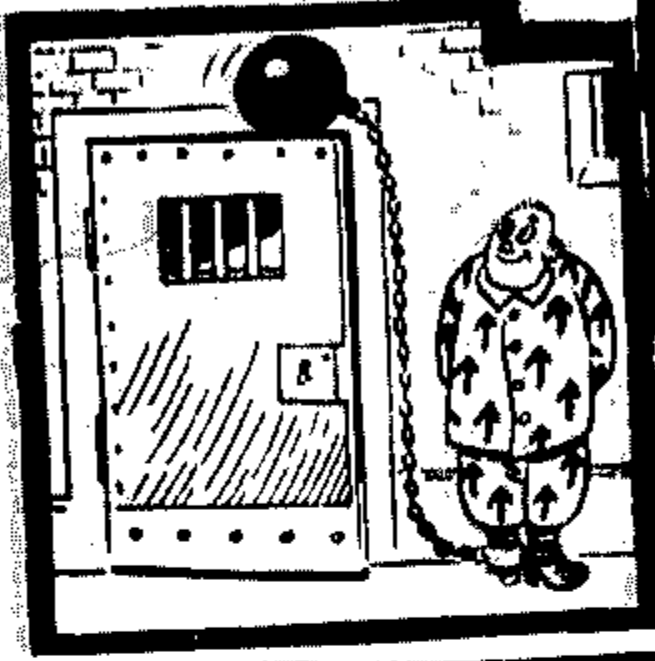
جیل وارڈر کو ڈانٹنے پھٹکارنے سے روکنے کا طریقہ
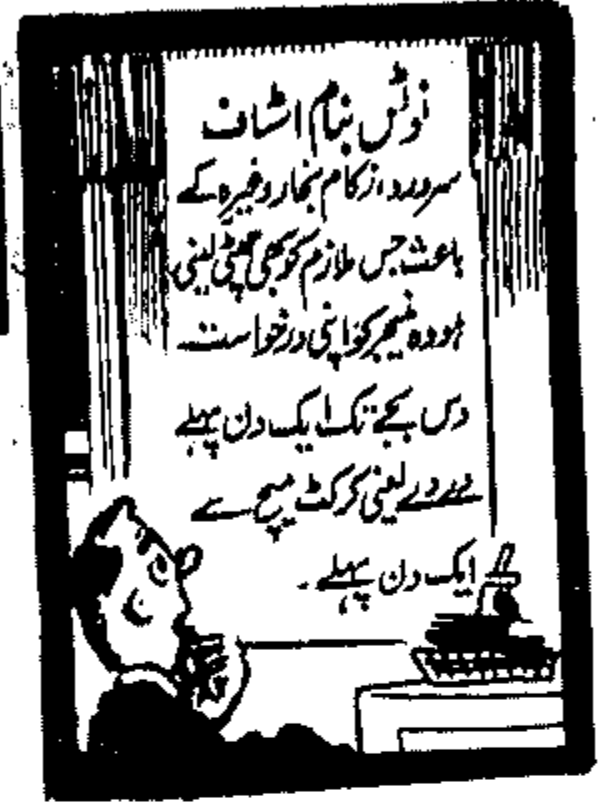
کیا آپ ٹیچر کے دیئے ہوئے ان سوالوں کے جواب بتا سکتے ہیں؟

کون کہتا ہے کہ میں آرام کرتے کرتے تھکتا نہیں ——
اس تھکن کو دور کرنے کے لئے میں آرام کرتا ہوں
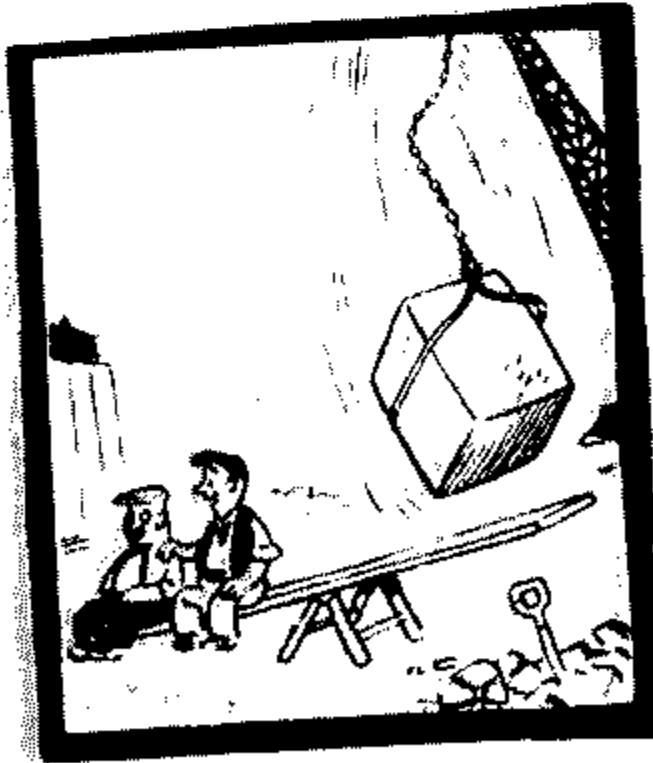
نجومی نے بتایا تھا کہ تمہاری قسمت میں جلد اونچا اُٹھنا لکھا ہے

احمد جمال پاشا

مسٹر اسکاٹ

اپنی ذات سے دمڑی سہالی چمڑی والا یوں ہی کون سے کم کنجوس مکھی چوس تھے کہ ان کے پتاجی نے انہیں اودھر کا مال اُدھر کرنے کی ٹریننگ کے لیے کنجوسوں کے دیس اسکاٹ لینڈ کی شالی لاک یونیورسٹی میں بھیج دیا، جہاں سے آنے کے بعد مسٹری دمڑی اپنے دھندے میں اتنے چالو ہو گئے کہ سب نے ان کا نام مسٹر اسکاٹ رکھ دیا۔

مسٹر اسکاٹ ہمارے بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک بار ایک اَٹھنی نِگل گئے۔ جب اٹھنی نکلوانے کے لئے ان کے پتاجی اُنہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے لگے تو اُنہوں نے اپنی تکلیف کی پَروا نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میری اٹھنی نکلوانے ڈاکٹر کے پاس تو لئے جا رہے ہیں، مگر یہ تو بتا دیجیے کہ اٹھنی مجھے مل ہی جائے گی یا ڈاکٹر ...پ کرے گا؟"

مسٹر اسکاٹ کو ایک زمانے میں خواب میں ایک بہت خوفناک بھوت نظر آنے لگا تھا۔ یہ بھوت اتروانے

کے لئے وہ ایک پنڈت جی کے پاس گئے۔ پنڈت جی نے کہا ـــ " میں ایک ایسا منتر جپوں گا کہ بھوت سب بھاگ جائے گا۔" مگر بھوت بھگانے کا ایک ہزار روپیہ لوں گا۔

" ہزار روپے؟" مسٹر اسکاٹ حیرت سے چلاّئے اور بولے " رہنے دیجئے مہاراج! ہزار روپے کون خرچ کرے؟ میں اس بھوت ہی سے دوستی کرلوں گا۔"

ایک دن اسکول جاتے میں ہم لوگوں نے مسٹر اسکاٹ سے زبردستی ایک اکنّی ایک فقیر کو دلوادی۔ انہوں نے فقیر سے پوچھا " بابا جی! بھلا آپ اس رقم کا کیا کریں گے؟"

فقیر بھی کم مسخرہ نہ تھا اس نے بہت سوچ بچار کے بعد بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔" میں اتنی بڑی رقم کو یا تو گورنمنٹ کو آسان شرطوں پر قرض دے دوں گا یا کسی بہت بڑے بینک کے حصے خرید لوں گا۔ یا پھر آپ جیسا مشورہ دیں۔ ویسا کروں گا۔"

مسٹر اسکاٹ کی اسکول ہی کے زمانے کی عادت تھی کہ جہاں کسی نئے آدمی سے ان کی ملاقات ہوئی اور جھٹ اُس سے فرمائش کردی۔

" ذرا سگریٹ کے لئے ماچس عنایت فرما دیجئے۔"

ماچس ملنے کے بعد کہتے۔" اب ذرا سگریٹ عنایت فرمادیجئے۔" اور نیا آدمی مجبوراً غور سے گھورتے ہوئے بے بس ہوکر کہتا۔" لیجئے نوش فرمایئے۔"

ایک دن مسٹر اسکاٹ نے مجھ سے کہا۔" یار مجھے ایک سگریٹ پلاؤ۔"

میں نے کہا " مگر تم نے تو سگریٹ پینا چھوڑنے کا اعلان کردیا ہے۔"

بولے " بالکل درست۔ میں سگریٹ چھوڑنے کے بالکل پہلے اسٹیج میں ہوں یعنی فی الحال سگریٹ خرید کر پینا چھوڑ دیا ہے۔"

مسٹر اسکاٹ ہمارے پچاس روپے ہڑپ کئے بیٹھے تھے۔ ہم مروت میں مانگتے نہیں تھے۔ ایک دن ہمیں روپے کی سخت ضرورت تھی۔ ہم نے انہیں یاد دلانے کے لئے اشارتاً کہا۔" بھئی آج رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ تم نے مجھے پچاس روپے لاکر دئے ہیں۔"

مسٹر اسکاٹ نے فوراً کہا، " چلو اچھا ہوا میں سبکدوش ہوگیا۔ مجھ پر پچاس روپے تمہارے قرض بھی تھے۔"

اس کے بعد ہم نے ایک دن ذرا سختی سے اپنا روپیہ منگوایا۔ مسٹر اسکاٹ نے فوراً مجھے پچاس روپے کا چیک بھیج دیا۔ کئی دن بعد ملاقات ہوئی۔ مسٹر اسکاٹ نے پوچھا۔" میں نے آپ کو جو چیک بھیجا تھا، کیا وہ مل گیا؟"

میں نے کہا " مجھے یہ چیک دو مرتبہ ملا۔ ایک بار یہ تمہارے پاس سے آیا اور دوسری بار یہ بینک سے واپس ہوا، اس لئے کہ تمہارے اکاؤنٹ میں کوئی رقم نہیں ہے۔"

" اس پر مسٹر اسکاٹ نے ہنستے ہوئے کہا" دراصل

مجھے سو روپے اُدھار چاہیئے تھے۔ ان میں سے پچاس روپے تم نے مجھے دے دیئے تھے۔ اس طرح میرے پچاس روپے تمہارے ذمے رہے اور یوں حساب برابر ہو گیا۔

ایک مرتبہ بیماری کے زمانے میں ہماری طبیعت کیک کھانے کو چاہی۔ مسٹر اسکاٹ جھٹ سے بولے۔ "لاؤ میں لادوں۔" میں نے انہیں ایک اٹھنی دی کہ چار آنے کا ایک کیک مجھے لادو اور دوسرا تم کھالو۔"

تھوڑی دیر بعد مسٹر اسکاٹ واپس آئے اور بولے دکان دار کے پاس ایک ہی کیک تھا۔ وہ میں نے کھا لیا۔

میں نے کہا۔ "اور باقی چونی۔؟"

بولے "کہیں گر گئی۔"

ایک بار مسٹر اسکاٹ ایک ہوٹل میں ہم لوگوں کے اصرار پر کھانے کا بل ادا کرنے پر بالکل مجبور ہو گئے۔ بیرا بل لایا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ہوٹل کے کھانے کا بل دس روپے نو نے پیسے کا ہے تو وہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگے اور بیرے سے ڈانٹ کر کہا۔ "میں نے کھانا کھایا ہے یا باٹا کا جوتا خریدا ہے؟"

ہر مسافر ریل یا بس سے اُترتے وقت مڑ کر ڈبے میں دیکھتا ہے کہ وہ کچھ سامان تو نہیں چھوڑے جا رہا ہے اور اگر گھر والے یا نوکر ساتھ میں ہوں تو ریل یا بس میں اُتر کر سیدھا چلا جاتا ہے۔ مگر مسٹر اسکاٹ ریل یا بس سے اُترتے وقت احتیاطاً مڑ کر یہ ضرور دیکھ لیتے کہ کہیں اور مسافر تو سامان چھوڑ کر نہیں جا رہا ہے۔

مسٹر اسکاٹ اسی طرح دوسرے مسافروں کا سامان ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب ایک دوسرے شہر میں انٹرویو کے لئے پہنچے تو انٹرویو لینے والے نے

ذرا اپنے پیچھے دیکھو کتنا خوب صورت منظر ہے۔

پوچھا۔ "اگر کسی مقام پر زیادہ بھیڑ اکٹھی ہو جائے تو تم اُسے منتشر کرنے کے لئے کیا کرو گے؟"

مسٹر اسکاٹ نے جواب دیا۔ "میں فوراً اپنا ہیٹ اُتار کر اُن لوگوں سے پیسہ مانگنے لگوں گا۔ اور مجمع خود بخود منتشر ہو جائے گا۔"

انٹرویو سے واپسی پر مسٹر اسکاٹ ایک کشتی سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک دریا میں طوفان آگیا۔ قریب تھا کہ کشتی ڈوب یا اُلٹ جاتی کہ مسٹر اسکاٹ نے اپنی کنجوسیوں اور چالاکیوں سے توبہ کرتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔ "اے خدا! اگر میں زندہ بچ گیا تو وعدہ کرتا ہوں...."

میں جلدی سے بول اُٹھا۔ "ٹھیرو! ٹھیرو! کوئی وعدہ نہ کرو۔ وہ سامنے ہمیں بچانے کے لئے ایک امدادی کشتی آرہی ہے۔"

ایک مرتبہ شہر میں ہم لوگوں کے ایک بہت دولت مند دوست کا انتقال ہو گیا۔ مسٹر اسکاٹ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا مرحوم

آپ کے رشتے دار تھے ؟"

مسٹر اسکاٹ نے کہا "مرحوم میرے رشتے دار نہیں تھے۔ اِسی پر تو رونا آ رہا ہے۔ اگر میں اُن کا رشتے دار ہوتا تو آج مجھے بھی ترکے میں لاکھوں رُپے کی جائیداد ملتی۔"

مسٹر اسکارٹ ایک دفعہ لانڈری میں پتلون دُھلوانے گئے۔ جب وہ پتلون لینے گئے تو لانڈری والوں نے ایک درجن کپڑوں کی دُھلائی کا بل پیش کر دیا۔ اُنھوں نے پُوچھا "اتنا بڑا بل کیوں ؟"

لانڈری والے نے کہا "اس لئے کہ پتلون تو واقعی ایک ہی آپ نے دُھلنے کے لئے دی تھی۔ مگر ایک درجن کپڑے اس کی جیبوں کے اندر بھرے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ ہم لوگوں نے ایک اخبار نکالا۔ اُس میں مسٹر اسکاٹ کی کنجوسیوں اور چالاکیوں کا خوب خاکہ اُڑا دیا۔ مسٹر اسکاٹ غصّے میں بھرے ہوئے ہمارے پاس آئے اور بولے "اگر تم لوگوں نے اپنے اخبار میں میرے خلاف لکھنا نہ بند کیا تو پھر میں تمہارا اخبار مانگ کر پڑھنا بند کر دوں گا۔!"

ایک مرتبہ ایک پردیسی مسافر شہر میں راستہ بھٹک گیا۔ اُس نے مسٹر اسکاٹ سے کہا "میں کھو گیا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے میرے ہوٹل تک پہنچا دیجئے۔"

مسٹر اسکاٹ نے پوچھا "کیا تمھیں تلاش کرنے کے لئے کسی انعام کا اعلان ہوا ہے ؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں"

اس پر مسٹر اسکاٹ نے کہا "اگر تمہیں تلاش کرنے پر اب تک کسی انعام کا اعلان نہیں ہوا ہے تو تم سمجھو کہ ابھی تک گم شدہ ہو" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔

ایک دفعہ ایک صاحب نہاتے میں دریا میں ڈوبنے لگے۔ مسٹر اسکاٹ انہیں دوڑ کر دریا سے نکال لائے۔ ایک صاحب نے اُن کی بہادری کی تعریف کی۔ اس پر مسٹر اسکاٹ بولے "مجھے اِن سے دو سو رُپے اُدھار ملنے کی اُمید ہے، ورنہ وہ بھی ڈوب جاتے۔

مسٹر اسکاٹ ایک لڑکی سے شادی پر اصرار کر رہے تھے۔ لیکن پریشان اس لئے تھے کہ زندگی بھر گھر کا خرچ کیسے چلائیں گے۔ لڑکی نے رائے پیش کی "کیا ہم تمہارے والدین کے ساتھ نہیں رہ سکتے ؟" مسٹر اسکاٹ نے کہا "مگر وہ تو خود ابھی تک اپنے والدین کے پاس رہ رہے ہیں۔"

شادی کے بعد ہنی مون منانے کے لئے مسٹر اسکاٹ ایک بہت بڑا تھیلا لے کر بس پر سوار ہوئے۔ کنڈکٹر نے اس تھیلے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے کہا۔ بہت مشکل سے مسٹر اسکاٹ تھیلے کا آدھا ٹکٹ خریدنے پر راضی ہوئے مگر جب کنڈکٹر نے بہت سختی کے ساتھ کہا کہ اس تھیلے کا وزن بہت زیادہ ہے اس لئے آپ کو اس کا پُورا ٹکٹ خریدنا ہوگا تو مسٹر اسکاٹ نے تھیلا کھول دیا اور بولے، "بیگم باہر نکل آؤ! اگر پُورا ٹکٹ ہی خریدنا پڑے تو پھر تھیلے میں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟

مسٹر اسکاٹ بال بچے دار ہونے کے بعد ایک ٹیکسی سے سسرال جا رہے تھے۔ وہ ٹیکسی والے کو کم کرایہ دینا چاہتے تھے۔ ٹیکسی ایک دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ اتنے میں ٹیکسی والے کو اتنا غصہ آگیا کہ اُس نے مسٹر اسکاٹ کا سوٹ کیس اٹھا کر دریا میں پھینک دیا اسی کے ساتھ مسٹر اسکاٹ غصّے میں آپے سے باہر ہو کر چلائے ہی کیا کم تھا کہ تم مجھ سے زیادہ کرایہ وصول

کرنا چاہتے تھے اور اب تم نے ڈبونے کے لئے میرے چھوٹے بچے کو دریا میں پھینک دیا۔

مسٹر اسکاٹ نے ایک دفعہ اپنی بیوی کی شکایت کرتے ہوئے کہا، "پرسوں اُنہوں نے پانچ سو رُوپے مانگے تھے۔ کل تین سو اور آج سو رُوپے مانگ رہی تھیں" میں نے کہا، "بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وہ کیا کرتی ہیں ان رُوپیوں کا؟"

مسٹر اسکاٹ نے جواب دیا، "مجھے کیا معلوم؟ میں نے تو کبھی اُنہیں رُوپے دیئے ہی نہیں"

مسٹر اسکاٹ کی بیوی بڑی حسابی تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی عمر کو دو سے تقسیم کر دیتیں، اپنے لباس کی قیمت کو چار سے ضرب دیتیں، اپنے شوہر کی آمدنی پانچ گنا بڑھا کر بتاتیں، اور اپنی تمام سہیلیوں کی عمر میں دس سال کا اضافہ کر دیتیں۔

ایک دفعہ مسٹر اسکاٹ نے بیوی سے عاجز آکر اپنی آمدنی کے پُورے ایک ہزار رُوپے بیوی کو دے دیئے اور ایک کاپی بھی اور کہا "لو سنبھالو گھر اور میرے کاروبار کا خرچ۔ لیکن حساب لکھتی رہنا۔ دس ہی دن کے بعد بیوی نے کہا، "رُوپے تو ختم ہو گئے۔ اور چاہئیں"

مسٹر اسکاٹ نے حیران ہوتے ہوئے کہا، "وہ کیسے؟۔ ذرا کاپی تو دکھانا۔ حساب دیکھوں"

بیوی نے کاپی مسٹر اسکاٹ کے ہاتھ میں دے دی۔ اُنہوں نے کھول کر دیکھی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ "رُوپے ملے: ایک ہزار" دوسرے صفحے پر لکھا تھا۔ "خرچ ہو گئے: ایک ہزار"

اس پر مسٹر اسکاٹ اور اُن کی بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ دونوں ایک دُوسرے کی فضول خرچیوں سے عاجز تھے۔

بیوی نے کہا، "تم مجھے فضول خرچ کہتے ہو۔؟ اپنے آپ کو دیکھو۔ آگ بجھانے والا سلینڈر فضول میں خرید لائے تھے۔ مگر پانچ سال میں تم نے اسے ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کیا۔

مسٹر اسکاٹ کو ایک انشورنس ایجنٹ نے گھیرا اُنھوں نے پوچھا، "اگر آج میں اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ کراؤں اور کل وہ مر جائیں تو مجھے کیا ملے گا؟"

انشورنس ایجنٹ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "پیسہ بھی مل سکتا ہے اور پھانسی بھی"

دوسرے دن صبح کو جب نوکر نے مسٹر اسکاٹ کو سوتے سے جگا کر بتایا کہ ان کی بیوی مر چکی ہیں۔ تو اُنہوں نے اُٹھ کر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ واقعی بیوی مر چکی ہے فوراً نوکر کو آواز دی۔ "دیکھو! آج ناشتے میں تم صرف ایک ہی انڈا اُبالو گے۔

مسٹر اسکاٹ کے مرنے کے بارے میں بہت سے قصّے مشہور ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی موت پھانسی پا کر ہوئی۔ اُن کے دوستوں میں سے ایک صاحب نے بتایا ہے کہ اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ جب مسٹر اسکاٹ سے فرشتوں نے پوچھا کہ "گناہ اور ثواب برابر ہونے کی صورت میں آپ جنّت میں جانا پسند کریں گے یا دوزخ میں؟" تو انہوں نے فوراً کہا۔ "وہاں بھیجئے جہاں دو پیسے کا فائدہ ہے"

ہمیں نہیں معلوم کہ مسٹر اسکاٹ جنّت میں ہیں یا دوزخ میں مگر وہ جہاں بھی رہیں، ہماری دُعا ہے کہ خوش رہیں۔
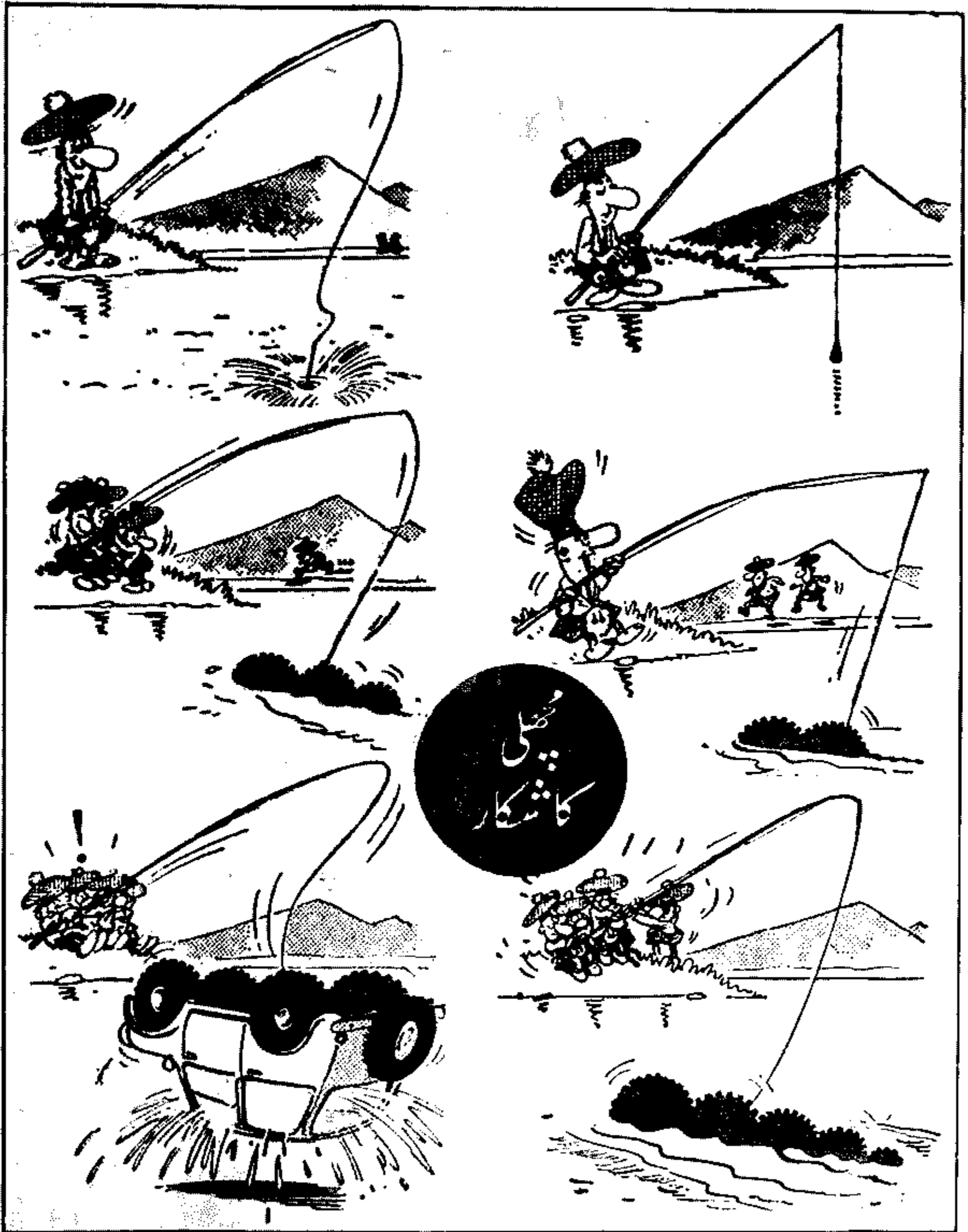
●●

مچھلی کا شکار

نیا دور

بہاروں نے پھولوں کے نغمے سنائے
ستاروں نے پرتو اُجالے بچھائے
نظاروں نے کیسے نظارے دکھائے
زمیں مسکرائی، فلک مسکرایا
نیا دور لے کر نیا سال آیا

دلوں کو نئی زندگی مل گئی ہے
گیا غم دلوں کو خوشی مل گئی ہے
خزاں کو بھی اب تازگی مل گئی ہے
زمیں مسکرائی، فلک مسکرایا
نیا دور لے کر نیا سال آیا

گلستاں گلستاں بہاروں کے گھر ہیں
ہر اک پھول میں چاند تاروں کے گھر ہیں
بیاباں میں بھی لالہ زاروں کے گھر ہیں
زمیں مسکرائی، فلک مسکرایا
نیا دور لے کر نیا سال آیا

چلو دوستو گیت خوشیوں کے گائیں
کہ چلتی ہیں گلشن میں تازہ ہوائیں
ہوئیں آج روشن دلوں کی فضائیں
زمیں مسکرائی، فلک مسکرایا
نیا دور لے کر نیا سال آیا

ثاقب زیروی

غالب نمبر

اُردو کے عظیم شاعر اسداللہ خاں غالبؔ کے سینکڑوں دیوان شائع ہو چکے ہیں ——— لیکن غالب کا نیا دیوان جو شبستاں اُردو ڈائجسٹ نے غالب نمبر کی شکل میں شائع کیا ہے۔ سب سے نیا اور سب سے خوب صورت ہے۔ اس میں غالب کا مکمل دیوان ہے جو آج تک ایک جلد میں کسی نے پیش نہیں کیا ہے۔ اس میں غالب کا وہ کلام بھی ہے جو متنازعہ ہے اس میں غالب کا باتصویر اور رنگین دیوان ہی نہیں غالب پر کہی گئی شاہ کار نظمیں بھی شامل ہیں —— غالب پر لکھے گئے مضامین ہیں۔ غالب اور غالب پرستوں کی تصاویر ہیں۔ اگر آپ کو دیوان غالب چاہیئے تو شبستاں اُردو ڈائجسٹ کا "غالب نمبر" ہی لیجئے کیوں کہ یہ ہی سب سے خوب صورت ہے، سب سے مکمل ہے۔ قیمت صرف پانچ روپلے ہے۔

ہم سے منگائیے یا اپنے ایجنٹ سے طلب کیجئے۔

شبستاں اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ا

ڈاکٹر کیول دھیر

موتی

اِس کا نام کینو تھا۔ وہ ملّاح تھا اور 'لاپیج' نام کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اپنی بیوی جوانا اور ننھے بچّے کوئیوٹو کے ساتھ وہ ہنسی خوشی اپنی زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ اس کا کام سمندر سے موتی نکالنا تھا۔

ایک روز ایک بچھّو نے کینو کے بچّے کے کندھے پر ڈنک مار دیا۔ کینو نے فوراً بچھّو کو پکڑ کر مسل ڈالا۔ اس کی بیوی نے بچّے کے کندھے پر اس جگہ ہونٹ رکھ دیے جہاں بچھّو نے ڈنک مارا تھا اور اس کے زہر کو چوس چوس کر وہ تھوکنے لگی۔ لیکن بچّہ درد کی وجہ سے چلّائے ہی جا رہا تھا۔ اس کی چیخ پکار سُن کر آس پڑوس کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ کینو کا بھائی جُوآن اور اس کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی وہاں آ گئے تھوڑی دیر میں گاؤں بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ کینو کے بچّے کو بچھّو نے کاٹ لیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کینو کی جھونپڑی کے سامنے سارے گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے۔

"کوئی آدمی ڈاکٹر کو تو بُلا لاؤ۔" کینو نے بھیڑ کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر بہت لالچی ہے وہ یہاں نہیں آئے گا۔" بھیڑ میں سے کسی نے جواب دیا۔ گھبراہٹ میں کینو نے اپنے بچّے کو اُٹھایا اور اپنی بیوی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چل دیا۔

کس کا فون ہے

ڈاکٹر کے مکان پر جب اس نے دستک دی تو چپڑاسی باہر آیا۔

"میرے بچّے کے بچھو نے کاٹ لیا ہے" اسے دیکھتے ہی کینو بولا ـــــ

لیکن ڈاکٹر صاحب کی فیس کے لئے تمہارے پاس روپئے ہیں ؟ چپڑاسی نے پوچھا۔

کینو نے کچھ موتی اُسے دینے چاہے، لیکن چپڑاسی نے موتی واپس کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں"۔ کینو نے بار بار اس سے درخواست کی، لیکن چپڑاسی دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔

کینو کی پریشانی بڑھ گئی۔ کیوں کہ اس کے بچّے کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کینو اپنے بیوی اور بچّے کو لے کر سمندر کی طرف چل پڑا۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنی کشتی کھولی۔ جیرانا بچّے کو لے کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ کشتی میں غوطہ لگانے والا پتھر، رسّیاں، ٹوکری اور پتوار سب کچھ موجود تھا۔ بچّے پر زہر کا اثر بڑھتا ہی جا رہا تھا اور سوجن اس کے چہرے تک پہنچ گئی تھی۔ جیرانا سمندر کے پانی کے جھاگ لے کر اپنے بچّے کے کندھے، گردن اور چہرے پر ملنے لگی اور کینو سمندر میں غوطہ لگانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے کوئی اچھا سا موتی مل جائے تو اپنے بچّے کا مناسب علاج کرا لے۔

غوطہ لگا کر کینو جب باہر آیا تو ایک سیپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ چاقو کی مدد سے جب اس نے سیپ کو توڑا تو اس میں سے ایک بڑا سا چمک دار موتی نکلا، اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ واقعی وہ نہایت قیمتی موتی تھا۔ اس کی بیوی بھی خوشی سے موتی کی طرف دیکھ رہی تھی اتنے میں اس کی نظر اپنے بچّے کے چہرے پر گئی اور وہ خوشی سے چلاّ پڑی "کینو! بچّہ ٹھیک ہو رہا ہے!" سمندر کے جھاگ نے بچّے پر جادو کا سا کام کیا تھا اور اس پر زہر کا اثر کم ہونے لگا تھا۔

سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ کینو کو ایک بے حد قیمتی موتی ملا ہے۔ ڈاکٹر نے جب یہ خبر سُنی تو فوراً وہ کینو کے جھونپڑے پر پہنچا اور کہا "مجھے معاف کرنا بھائی! جب تم بچّے کو لے کر آئے تھے تو میں گھر پر نہیں تھا ـــــ اب بچّے کا کیا حال ہے ؟"

"ٹھیک ہے اب" کینو نے خشک لہجے میں کہا۔

بچھو کا زہر بہت خطرناک ہوتا ہے" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر قریب لیٹے ہوئے بچّے کو دیکھنے لگا اور دوا دینے کے بعد بولا "اب زہر کا اثر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ہاں! میری فیس کب دے رہے ہو ؟"

"میں موتی بیچ کر آپ کی فیس دے دوں گا" کینو نے جواب دیا۔

"موتی ؟ کون سا موتی ؟" ڈاکٹر نے جان بوجھ کر

حیرانی ظاہر کی۔"

"ایک بہت ہی قیمتی موتی کینو کے ہاتھ لگا ہے۔ ایسا موتی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا" قریب کھڑے لوگوں نے کہا۔

"اچھا! موتی اگر سچ مچ اتنا قیمتی ہے تو فوراً مجھے دے دو میں تمہاری امانت تجوری میں بند کر کے رکھ لوں گا۔ یہاں چوری کا ڈر ہے۔ ڈاکٹر نے چالاکی دکھاتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں" کینو نے جواب دیا اور ایک طرف زمین کی جانب دیکھنے لگا جہاں اس نے موتی دبا رکھا تھا، ڈاکٹر کی نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں اور وہ سمجھ گیا کہ کینو نے موتی کہاں چھپا رکھا ہے۔ جگہ بھانپ کر ڈاکٹر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

سونے سے پہلے کچھ سوچ کر کینو نے موتی زمین میں سے نکالا اور اپنی چٹائی کے نیچے رکھ دیا۔ جوانا سو گئی تھی لیکن کینو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آدھی رات کو اندھیرے میں اسے زمین کھودنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اُٹھا اور چاقو لے کر زمین کھودنے والے پر جھپٹ پڑا۔ لیکن اس کا وار خالی گیا۔ چور نے بھاگتے ہوئے کینو کے سر پر وار کر دیا تھا شور سن کر جوانا جاگ پڑی۔ روشنی جلا کر اس نے دیکھا تو کینو کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے کہا " کینو! یہ موتی منحوس ہے۔ اسے کہیں پھینک دو۔ یہیں یہ برباد کر دے گا۔"

"نہیں جوانا! اسے میں کل ہی بیچ دوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

دوسرے دن آس پاس بھی یہ خبر پھیل گئی کہ آج کینو موتی بیچنے جا رہا ہے۔ اپنے بھائی کے ساتھ موتی بیچنے کے لئے وہ شہر پہنچا۔

"یہ موتی ہے تو نقلی، لیکن اس کا ایک ہزار روپیہ میں تمہیں دے دوں گا۔" جوہری نے موتی دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ یہ موتی اصلی ہے" کینو نے کہتے ہوئے موتی واپس لے لیا۔ تاجر سے اس کی کچھ گرما گرمی بھی ہو گئی۔ کینو موتی لے کر گاؤں واپس آگیا۔

اُسی روز شام ڈھلے کینو جب اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑا تھا تو کسی نے اس پر حملہ کر دیا۔ جوانا قریب ہی کھڑی تھی پاس پڑا ہوا پتھر اُٹھا کر جب وہ کینو کی مدد کے لئے آگے بڑھی تو حملہ آور بھاگ چکا تھا۔ اُسی رات ایک بار پھر کسی نے کینو پر حملہ کر دیا۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ جوانا نے ایک بار پھر کہا " کینو! یہ موتی بہت منحوس ہے۔ اسے سمندر میں پھینک دو" لیکن کینو رضامند نہیں ہوا اور بولا " کل صبح ہوتے ہی موتی میں بیچ دوں گا۔ چلو! اب سو جاؤ۔"

نیند دونوں کو نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جوانا نے کینو کو آنکھیں بند کئے لیٹے دیکھا تو سمجھی کہ کینو سو رہا ہے اُس نے موتی اُٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ کینو جاگ رہا تھا لیکن وہ خاموش رہا اور یہ دیکھنے کے لئے جوانا کا پیچھا کرنے لگا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر جوانا نے موتی پھینکنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ لپک کر کینو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور غصے سے زور کا ایک چانٹا اُس کے منہ پر مارا اور موتی لے کر واپس اپنے جھونپڑے کی

طرف آنے لگا۔ راستے میں اچانک ایک آدمی اس پر جھپٹا اور اس کی تلاشی لینے لگا۔ کینو سنبھل گیا اور اس نے چاقو حملہ آور کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ حملہ آور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس وقت تک جوآنا بھی وہاں پہنچ گئی۔ بولی "کینو! تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

یہ سُن کر کینو گھبرا گیا اور کہنے لگا "تم جاکر بچے کو اُٹھا لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد جوآنا جب بچے کو لائی تو اس نے بتایا کہ ان کے جھونپڑے کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔ چند لمحے وہ دیر سے پہنچتی تو نہ جانے بچہ زندہ بھی رہتا یا نہیں — اپنے بچے کے ساتھ وہ دونوں اسی وقت راجدھانی کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات بھر وہ چلتے رہے۔ صبح ہوئی تو سڑک چھوڑ کر وہ درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ اچانک انہیں آہٹ سی سُنائی دی۔ کینو سڑک کے قریب جھاڑیوں میں جا چھپا۔ اس نے شہر کی طرف سے تین آدمیوں کو آتے ہوئے دیکھا۔ دو پیدل تھے جو بار بار سڑک پر جھک کر قدموں کے نشان کھوج رہے تھے۔ تیسرے آدمی نے کمبل اوڑھ رکھا تھا اور وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ کینو نے چاقو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اُسے ہی تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے جوآنا سے کہا "ہمیں جلدی سے جلدی پہاڑیوں پر چڑھ کر چھپ جانا چاہئے" اور وہ دونوں بچے کے ساتھ ایک جانب بڑھ گئے۔ اوپر پہاڑ میں کئی غار تھے۔ کینو ایک محفوظ غار میں جوآنا اور بچے کو لے گیا۔

سارا دن یوں ہی گذر گیا۔ رات ہوتے ہوتے پیچھا کرنے والے بھی اسی طرف آ نکلے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا کہ کینو یہیں کہیں ہوگا۔ کینو نے محسوس کیا کہ وہ کافی نزدیک ہیں۔ اُن کے بچے نے رُوں — رُوں — کی تو ان میں سے ایک آدمی بولا "آواز کیسی ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی بچہ رو رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی بھیڑیئے کا بچہ ہو۔ گھبراؤ نہیں میری رائفل کی ایک گولی اسے ٹھنڈا کر دے گی" دوسرے آدمی نے کہا یہ سُنتے ہی کینو کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ کچھ سوچ کر اس نے چاقو اُٹھایا اور اُدھر بڑھا۔ اُن کے قریب پہنچ کر اُس نے چھلانگ لگائی اور چاقو رائفل والے آدمی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ لیکن اس سے پہلے رائفل چل چکی تھی؛ کینو نے دوسرا وار اس کے ساتھی پر کیا اور اُسے بھی ختم کر دیا۔ رائفل اب کینو کے ہاتھ میں تھی، جس سے اُس نے تیسرے آدمی کو نشانہ بنا کر گولی چلا دی اور اُسے بھی وہیں ڈھیر کر دیا — چند لمحوں کے بعد اس نے دیکھا کہ گولی لگنے سے اس کا اپنا بچہ بھی دم توڑ چکا تھا۔

اگلے روز گاؤں والوں نے دیکھا کہ کینو اور جوآنا واپس گاؤں میں آ گئے تھے۔ کینو کے کندھے پر رائفل رکھی تھی۔ جوآنا خون سے لت پت کپڑے میں لپٹی کوئی چیز اُٹھائے ہوئے تھی — یہ اُن کے ننھے بچے کی لاش تھی، پہلے وہ اپنے جھونپڑے کی طرف گئے جو کب کا راکھ بن چکا تھا۔ کہیں کہیں سُلگتی لکڑیوں میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ لوٹ کر وہ سمندر کے کنارے آ گئے۔ کینو نے وہ قیمتی موتی اپنی جیب سے نکالا، غور سے اُسے دیکھا اور پھر پوری طاقت سے سمندر میں پھینک دیا۔ آنسوؤں بھری آنکھوں سے دونوں دیر تک ڈوبتے ہوئے موتی کو دیکھتے رہے۔

●●●

خضر برنی

کھلونا

کہتا ہے اک مست قلندر
جو کچھ ہے دھرتی کے اندر
پیارا پیارا، سندر سندر
آلو، شلغم، لال چقندر
چھوٹا بڑا یا لمبا بونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

شیر ببر اور ہاتھی گھوڑے
جنگل جنگل بھاگے دوڑے
دیکھے ان کے ہاتھ ہتھوڑے
بے گھر کئے نادان بگوڑے
عرش ہے سایہ فرش بچھونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

غنچہ و گل بول یا انگارے
رِل مل کو مل شوخ نظارے
کیسے حسیں ہیں پیارے پیارے
دھرتی کے یہ جگمگ تارے
سارا چمن ہے اپنا سلونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

پیارے بچو کہنا مانو
لمحے لمحے کو گردانو
بات ہماری سچی جانو
وقت کی قیمت کو پہچانو
بھول کے اپنا وقت نہ کھونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

کڑوی بات بھی ہنس کر سہنا
مل جل کر دنیا میں رہنا
بات کسی سے سخت نہ کہنا
میٹھا بول ہے اچھا گہنا
تانبا، پیتل، چاندی، سونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

سال نیا اک تحفہ لایا
ایسا کھلونا کبھی نہ پایا
دیکھ کے اس کو جی للچایا
آشی بھیا خوب سجایا
لعل، جواہر، موتی، سونا
دُنیا کی ہر شے ہے کھلونا

بوکنگ کا مقابلہ

وہ مارا !

شاباش !

اب بولو !

الیاس بھائی :
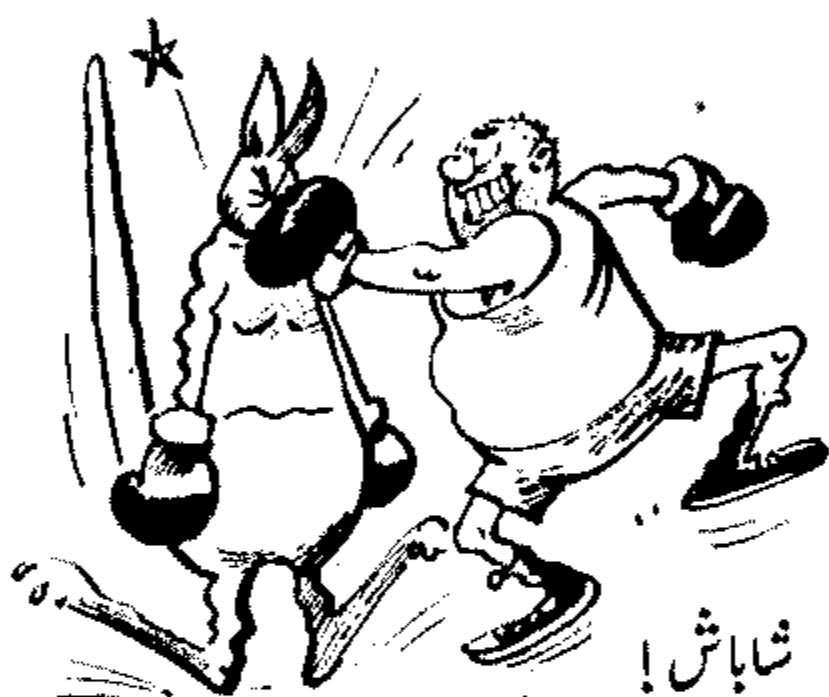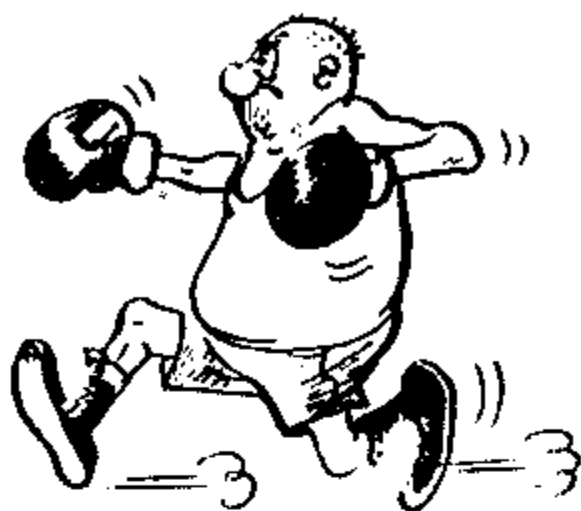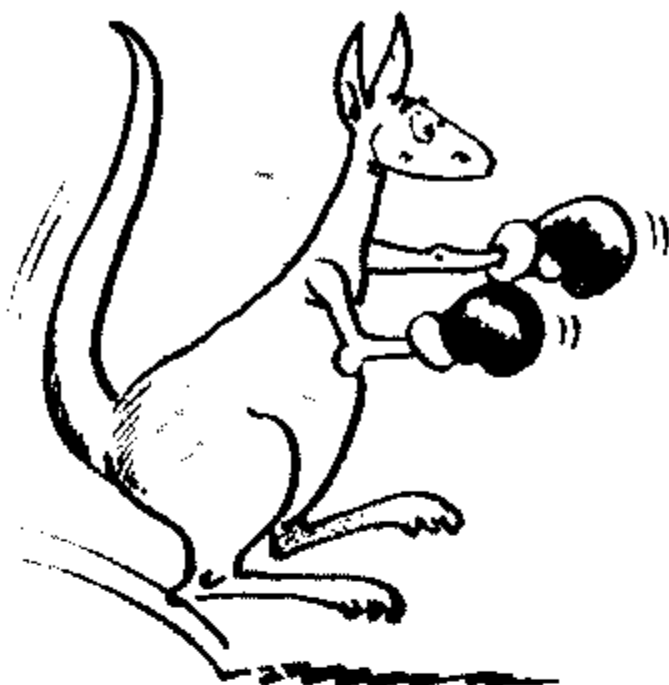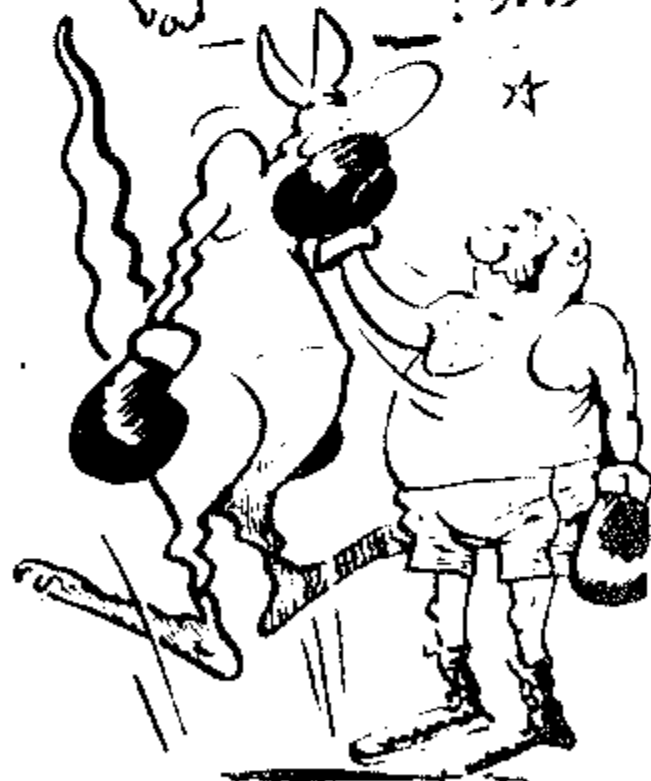
اُردو کے اس قاتل زمانے میں آپ اپنا محبوب خوبصورت رسالہ نکال رہے ہیں یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے۔ جہاز جتنا بڑا پرچہ اور اتنی کم قیمت! آپ کی ہمت قابلِ داد ہے۔ خدا آپ کو زندگی بھر خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔ میرا ناول "نیلی دنیا" کب چھپ کر بازار میں آرہا ہے؟

فیشن ہوگیا ہے کہ اُردو کے چند بڑے اَدیب آج کل یہ حماقت ذیخیز بات کہہ رہے ہیں کہ اُردو کا رسم الخط دیوناگری ہوجانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لہٰذا اسے بدل دینا چاہیے۔ یہ بات اگر کسی بڑے اور بزرگ آدمی نے کہی ہے تو ہرگز اس کا لحاظ نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ غلط بات ہر حال میں غلط ہے ــــ اُردو جیالی ہماری تہذیب وتمدن کی محافظ ہے۔

اُردو کا زندہ جاوید ہے ــــ اس کے تنِ مردہ میں جان ڈالی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ کھلونا کے پڑھنے والے ایک ایسی مہم شروع کریں جس کے تحت وہ بچے جو کسی مجبوری کی وجہ سے ہندی پڑھ رہے ہیں، اُردو کا یہ محبوب خوبصورت رسالہ بھی خرید کر پڑھیں

(اگر خدانخواستہ، بزرگوں کی ہٹ دھرمی اسی طرح قائم رہی تو مستقبل میں اُردو، دیوناگری رسم الخط میں بالکل اسی طرح پڑھی جائے گی جیسی میں نے لکھی ہے۔ خدا ہمیں اُس بُرے وقت سے بچائے)

سراج انور، دہلی

الیاس بھائی :

"پرائی مال" (دسمبر ۱۹۷۰) کی اشاعت کا شکریہ۔ آپ نے اس کہانی میں میرا نام صرف "محبوب نکہت" چھاپا ہے۔ براہ کرم آئندہ شائع کریں تو "آمبوری" کو بھی رہنے دیں۔ جنوری کے کھلونا میں "عقل مند ٹھگ" شاندار کہانی ہے۔ البتہ "اُجالوں کی منزل" پڑھ کر کافی مایوسی ہوئی۔ نہ جانے کیوں ابرار محسن جب بھی ہمارے رسولؐ کی زندگی پہ کچھ لکھتے ہیں تو "اَدب" کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ پچھلے سال بھی انہوں نے کھلونا کے ایک مضمون میں آں حضرت کی شانِ اقدس میں ایسی ہی بے اَدبی کی تھی، میں کبھی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ کوئی اللہ کے رسولؐ کو "وہ بولا" "وہ بھاگا" "وہ چونکا" جیسے گستاخانہ انداز میں یاد کرے۔ ہمارے درمیان موجود عام انسانوں کو بھی میں "وہ ہنسا" "وہ رویا" کہنا پسند نہیں کرتی۔ پھر وہ تو دُنیا کے سب سے بڑے انسان تھے محسنِ اعظم، بانیٔ انسانیت۔ اس عظیم انسانؐ کا نام ملائک بھی درود وسلام کے ساتھ لیتے ہیں تو پھر ہماری اوقات ہی کیا؟ محبوب نکہت آمبوری

بھائی جان :

جنوری کا کھلونا بہت دلچسپ ہے۔ اس میں ابرار محسن کا مضمون "اُجالوں کی منزل" گلاب کی طرح مہک رہا ہے۔ بلقیس خاتون نے "دوستی" کو حقیقت کے آئینہ میں اُجاگر کیا ہے "جان بچی لاکھوں پائے" عادل جعفری نے موجودہ تعلیم کے کھوکھلے پن کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ تابندہ حسن رضوی کا "عقل مند ٹھگ" بھی بُرا نہیں۔ ارے ہاں بھیا "تاریخ پارے" کہاں کھو گئے، ہم تو اسے کھلونا میں تلاش کرکے تھک گئے۔ اسے پھر شروع کیجیے۔ محمد عبدالسلام، حیدرآباد

آشی بھیا :

جنوری کے کھلونا میں ابرار محسن کی کہانی "اُجالوں کی منزل" پڑھ کر ساری شکایتیں دُور ہوگئیں۔ صحیح معنوں میں "اُجالوں کی منزل" ایسی کہانی ہے جس کو پڑھ کر خوشی بھی ہوتی ہے اور ہم بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ سچ کہتا ہوں اس کہانی کو میں عرصے تک اپنے ذہن سے مٹا نہیں سکتا۔

امیر انصاری، جورہاٹ (آسام)

آشی بھیا :

کھلونا جنوری ۱۹۷۱ ملا۔ سب ہی مضمون اچھے ہیں۔ "اُجالوں کی منزل" بہترین کہانی ہے۔ اس کے علاوہ خلیق انجم اشرفی کے "کرگی کے پھول"، "اوور کا نڈر کا رُعب" پسند آئیں۔ "عقل مند ٹھگ" پرانی کہانی ہے۔ کارٹون دیکھ کر ہنسی نہ رک سکی۔ آمنہ پروین، آکولہ

آشی بھیا :

"اُجالوں کی منزل"، "کرگی کے پھول" اور "دوستی" لئے جنوری کا کھلونا ملا۔ اُمید ہے سالنامہ بھی جلدی مل جائے گا۔ تصویری کارٹون پر ایک جگہ نمبر ۵۳ لکھا ہوا ہے اور اسی صفحے پر نیچے تصویری کارٹون نمبر ۴۵ لکھا ہے۔

علیم بلال، پٹھمہ، ضلع تھانہ

★ یہ تصویری کارٹون نمبر ۴۵ تھا۔ ادارہ کو اس غلطی پر افسوس ہے۔ ●●

بیٹا۔ ہماری کلاس میں ایک کے علاوہ سب پاس ہو گئے
باپ۔ وہ ایک کون ہے؟
بیٹا۔ ہمارے ماسٹر صاحب ہم سب آٹھویں کلاس میں چلے گئے لیکن وہ ساتویں ہی کو پڑھا رہے ہیں۔

میر سجان علی نثار علی امراؤتی کیمپ

رئیس۔ میں ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں۔
رمیش۔ وہ کیسے ؟
رئیس۔ صرف "نا" نکال کر۔

محمد دین، آگرہ

ماسٹر نے لڑکے سے ایک سوال پوچھا۔ سوال ذرا مشکل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دوسرے لڑکے نے اس کے کان میں چپکے سے کہا: ماسٹر صاحب بے وقوف ہیں؟

ماسٹر۔ (دوسرے لڑکے سے) ہائیں! ہائیں!! تم اسے کیوں بتا رہے ہو۔ وہ خود ہی سمجھ کر بتائے گا۔

زبیر احمد شمسی محمد آباد گہنہ

داروغہ۔ تمہارے گاؤں میں آگ لگ گئی تھی کچھ بچا بھی
کسان۔ آگ بجھانے والی موٹر بچ گئی وہ جب پہنچی آگ بجھ چکی تھی۔

نثار علی امراؤتی کیمپ

پہلا دوست۔ اگر میں راجہ ہوتا تو ساری دنیا پر راج کرتا۔
دوسرا دوست۔ اگر میں وزیر ہوتا تو تمہارے خلاف بغاوت کرتا
تیسرا دوست۔ اگر میں دولت مند ہوتا تو خوب دنیا کی سیر کرتا۔
چوتھا دوست۔ (یہ سن کر چڑ گیا) اگر میں جلاد ہوتا تو تم تینوں کا سر اڑا دیتا۔

فخر انسار، کلکتہ

جج۔ (چور سے) تم نے یہ سائیکل کیوں کر چرائی؟
چور۔ حضور یہ سائیکل تو قبرستان میں پڑی تھی میں سمجھا اس کا مالک مر گیا۔

رئیس احمد بریلی

استاد۔ (شاگرد سے) مرد کی جمع بتاؤ۔
شاگرد۔ (جلدی سے) مردود
استاد۔ (شاگرد سے) چھت کی جمع بتاؤ۔
شاگرد۔ چھتری

زاہدہ زرگر دراخی، سرینگر

ناہید۔ میری بلی تو اپنا نام بھی لے سکتی ہے۔
نیلم ۔ (تعجب سے) کمال ہے! کیا نام ہے اُس کا۔
ناہید۔ میاؤں۔

رخسانہ گل، کلکتہ
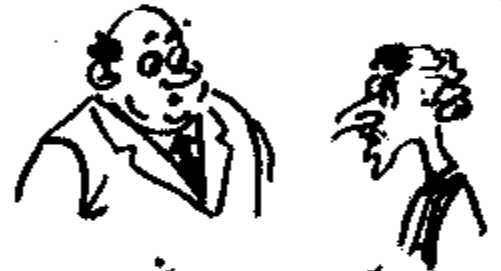
مالک۔ (نوکر سے) آج صرف پانچ روپے کا راشن لانا
نوکر۔ کیوں جناب
مالک۔ آج سے میری نوکری ختم ہوگئی ہے اب خرچ بھی تو کم کرنا پڑے گا۔
نوکر۔ نوکری تو جناب آپ کی ختم ہوئی ہے میری نوکری تو ابھی سلامت ہے میں تو دس روپے کا ہی لاؤں گا۔

ایم عیسیٰ، سنجر

شہر کے کسی ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے ہال سے باہر نکلتے ہوئے دوسرے سے کہا اس شاعر نے تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ ایک سپاہی جو دروازے کے پاس کھڑا تھا جلدی سے بھاگ کر ہال میں گھس گیا اور وہاں موجود لوگوں سے پوچھنے لگا جلدی بتاؤ وہ شاعر کہاں ہے جس نے مشاعرہ لوٹ لیا۔

حبیب الرحمٰن ملک، یوسف گیا

گاہک۔ (سبزی والے سے) دیکھو، اگر ترکاری ذرا بھی خراب نکلی تو میں پکی پکائی واپس کر جاؤں گا۔
سبزی والا۔ "بڑی مہربانی ہوگی حضور، ترکاری کے ساتھ دو روٹیاں ضرور لیتے آئیے گا"

عتیق احمد صدیقی، حیدرآباد

عارف۔ اے کل تم اتنے بلب کیوں لے جا رہے تھے؟
حامد۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ ماں باپ کا نام روشن کیا کرو۔

ثمینہ حسن، مرادنگر

تھانیدار۔ تم نے پولیس اسٹیشن کے سامنے ہی جیب کاٹنے کی کوشش کیوں کی؟
جیب کترا۔ تاکہ آپ کے سپاہیوں کو زیادہ دور جانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

یاسمین شاہین، دہلی

نتیجہ انعامی تصویر نمبر ۵۲

جنوری کے کھلونا میں ایک انعامی تصویر شائع ہوئی تھی جس کا سب سے اچھا اور دل چسپ عنوان " ندیدا " شاہناز (دہلی) نے لکھا ہے۔ انہیں دو روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ عنوانات بھی پسند آئے :

" میٹھا ہاتھ " (ایس۔ شاہد احمد شازی، آمبور) " لڈو کے مونہہ میں لڈو " (محمود احمد انصاری، الہ آباد) " مٹھائی کی چوری " (محمد غزنی حسین، بمبئی۔ مہر جلیل، پٹنہ) " آہا! نیا سال آیا! (محمد شجاع الدین اختر، سارا سپیدپیٹ) " اے لو وہ ہنسی آئی " (ماہ رُخ، دہلی)۔

جواب نظم " بوجھو تو جانیں " صفحہ ۸۲ : ۱۔ آم ۲۔ بھٹا

نتیجہ تصویری کارٹون نمبر ۵۲

جنوری کے کھلونا میں ایک تصویری کارٹون شائع ہوا تھا اس کا سب سے اچھا اور دل چسپ جواب فردوس احمد (ساکچی جمشید پور) اور حسین (ناگپور) نے لکھا ہے، " ارے اے آپ لوگ اُلٹے کیوں کھڑے ہیں۔ سیدھے ہوں تو تماشہ دکھاؤں "۔ انہیں پانچ پانچ دل چسپ کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ جواب بھی پسند آیا، " اب تم ہی بتاؤ —— سرکس میں ریچھ کی کیا ضرورت تھی " (یاسین فیروز، برہانپور)

نتیجہ نیا مقابلہ نمبر ۲۳

جنوری کے کھلونا میں نیا مقابلہ ۲۳ شائع ہوا تھا اس کا صحیح جواب صرف بیس بہن بھائیوں نے بھیجا ہے۔ انہیں دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں۔

۱۔ وسیم اختر، بھوپال ۲۔ شیخ ابراہیم، اکولہ ۳۔ احمد کمال، ...زہ ۴۔ وحیدہ اصغر، کلکتہ ۵۔ غفران، سنگرلیشی ۶۔ ضیا بانو، بمبئی ۷۔ ناصر عباس، علی گڑھ ۸۔ افسر میاں، رام پور ۹۔ محمد سلیم، بمبئی ۱۰۔ کے۔ اے شیخ، جلگاؤں ۱۱۔ نزہت فاطمہ، اورنگ آباد ۱۲۔ محمد شریف، سری نگر ۱۳۔ خلیل الحق، اکولہ ۱۴۔ ایم مسلم، آسنسول ۱۵۔ محمد طارق، کلکتہ ۱۶۔ شوکت علی، کلکتہ ۱۷۔ نسیم احمد، دھنباد ۱۸۔ علی اختر، علی گڑھ ۱۹۔ محمود حسین، علی گڑھ ۲۰۔ مبین الدین، کوٹہ

صحیح جواب: گھنٹی کے اندر لٹکنے والا حصہ نہیں ہے، گھڑی میں ۱۲ کی جگہ ۲۱ لکھا ہے، بچہ گاڑی کا ہینڈل نہیں ہے، کیتلی کا منھ غلط بنا ہوا ہے، دستانے میں ایک انگلی کم ہے، ٹرے اٹھانے کے لئے ایک طرف چھید نہیں ہے، جوتے میں لیس ڈالنے کے لئے ایک طرف چھید نہیں ہیں۔

نتیجہ تصویری پہیلیاں نمبر ۲۴

جنوری کے کھلونا میں پانچ ایسی تصویریں شائع کی گئی تھیں جنہیں آسانی سے پہچاننا مشکل تھا۔ اس کے ہمیں ۱۵۲ صحیح جواب ملے۔ قرعہ اندازی کے ذریعہ دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جا رہی ہیں:۔

انعام پانے والے بہن بھائی:

۱۔ ناہید ڈوگرہ، سری نگر ۲۔ صادق ظفر میتھن ۳۔ رخسانہ نظامی، لکھنؤ ۴۔ غزالہ اظہر، کانپور ۵۔ الیف رحمان، جلگاؤں ۶۔ ریاض، مالیگاؤں ۷۔ اسحاق احمد، بودھن ۸۔ رقیہ خاتون، ڈالٹن گنج ۹۔ ضیاء الحسن، بمبئی ۱۰۔ شکیلہ بانو، پرتم بٹ۔

ان کے علاوہ صحیح جواب بھیجنے والے کچھ بہن بھائی یہ ہیں:

عبدالحمید، بنگلور۔ رعنا ناہید، ہاتھرس۔ صبیحہ صابر، الہ آباد۔ درخشاں الیاس، دہلی۔ زینب، مدراس۔ مسعود عزیز، بھساول۔ شاذیہ انور، کلکتہ۔ اسحاق علی، اندور۔ سیما عظمت، دہلی۔ محمد نواب، دہلی۔ آسیہ خان، سری نگر۔ الیاس احمد، ملیح آباد۔ فرزانہ انصاری، بھیونڈی۔ سعیدہ بانو، میسور۔ غلام جیلانی، کلکتہ۔ بلال امین، سری نگر۔ شرف الدین، جلگاؤں۔ حمیدہ، دہلی۔ پرویز، دہلی۔ فریدہ افشاں، دہلی۔ رخسانہ گل، کلکتہ۔ جمیل احمد، مالیگاؤں۔ پروین بدر، جاجمئو۔ محمد حسین، بمبئی۔ عامر حبیب، کانپور۔ نیما ابراہیم، بھیونڈی۔ ریشما ہاشمی، علی گڑھ۔ مرزا طاہر، بمبئی۔ اختر بیگم، حیدر آباد۔ سعیدہ، بمبئی۔ اطہر حسین، سرونج۔ شبیر علی، کلکتہ۔ محمد طارق، ہاتھرس۔ غیاث احمد، مدراس۔ اقبال احسان، کانپور۔ محمد سلیم، بمبئی۔ جواد احمد، مدراس۔ محمد عمر، بمبئی۔ لیاقت علی، سہارنپور۔ محمد حنیف، نڈیاد۔ منصور گل، بمبئی۔ سعید حسن، کلکتہ۔ ابو سعود، بنگلور۔ محمد سرور، علی گڑھ۔ رحمان خاں، جلگاؤں۔ خلیق لاری، پٹنہ۔ محمد شمیم، پٹنہ۔ محمد فرید، پٹنہ۔ محمد یوسف، پٹنہ۔ یونس، پٹنہ۔ آفتاب عالم، کلکتہ۔ اختر سلیم، ناگپور۔ لیاقت حسین، کلکتہ۔ احسن علیم، ہمکنڈہ۔ فاروق، جھاجھا۔ مشتاق احمد، جھاجھا۔ نعیم اختر، بمبئی۔ صغیر احمد، دہلی۔ عطیہ کوثر، ہمکنڈہ۔ منصور، بمبئی۔ ابو الکلام، کھردہ۔ زین العابدین، کھردہ۔ نیل گوہر، آمبور۔ رفیق احمد، دہلی۔ تحسین خاں، آسنسول۔ شمیم، کٹیہار۔ احمد کمال، ہاوڑہ۔ انجم اشرف، ملکی جک۔ محسن علی، کلکتہ۔ عارف انور، کلکتہ۔ ارشد انور، کلکتہ۔ فرید الدین، پٹنہ

صحیح جواب: ۱۔ موٹر ۲۔ ہونٹ ۳۔ سیب ۴۔ کنگھا ۵۔ قینچی
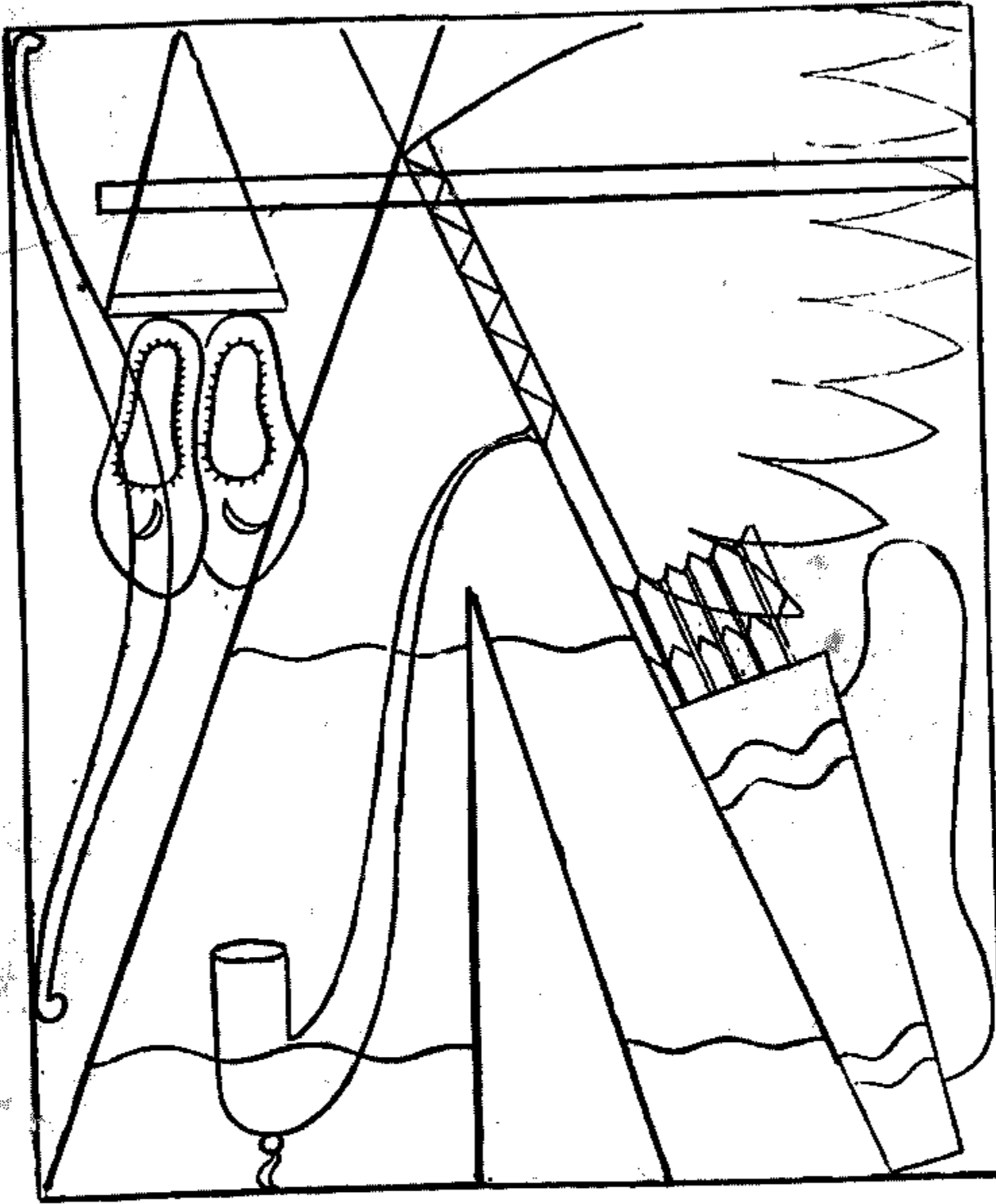
نیا مقابلہ نمبر ۳۴

اس تصویر کو غور سے دیکھو اور بتاؤ یہ کتنی چیزیں ہیں اور کیا کیا ہیں ——؟ اپنا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر " نیا مقابلہ نمبر ۳۴ ، ماہ نامہ کھلونا ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی " کے پتے پر بھیج دو (سال نامہ میں شائع ہونے والے تمام مقابلوں کے جواب ایک ہی لفافے میں علیحدہ علیحدہ کاغذ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں) ۲۲ فروری تک ملنے والے صحیح جواب بھیجنے والوں میں سے دس بہن بھائیوں کو دو دو روپے کی کتابیں انعام دی جائیں گی۔

نیا مقابلہ نمبر ۳۴ ، ماہ نامہ کھلونا ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی